مولانا احمد دین گکھڑوی

(۱۹۰۰ء — ۱۹۷۳ء)

محمد اسحاق بھٹی



مکتبہ قدوسیہ

مولانا احمد دین گکھڑوی

محمد اسحاق بھٹی

مکتبہ قدوسیہ

خوبصورت اور معیاری مطبوعات

کتاب و سنت
کی
نشر و اشاعت
کے لیے
کوشاں

اہتمام طباعت
ابوبکر قدوسی

اشاعت ـــــ ۲۰۱۱ء

مکتبہ قدوسیہ
رحمان مارکیٹ ● غزنی سٹریٹ ● اردو بازار ● لاہور پاکستان
قدوسیہ اسلامک پریس
Tel: +92-42-37351124,37230585
maktaba_quddusia@yahoo.com
www.quddusia.com

انتساب

حضرت الاستاذ مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمۃ اللہ علیہ کا اسمِ گرامی اس کتاب کے مختلف مقامات میں کئی مرتبہ آیا ہے۔ ان کا شمار مولانا احمد الدین گکھڑوی کے رفقائے کرام میں ہوتا تھا۔ انھوں نے خوب صورت اسلوب میں مولانا احمدالدین کی تصانیف پر تقریظیں لکھیں۔ دونوں بزرگ ہم ضلع بھی تھے اور دوست بھی۔ بعض مناظروں میں دونوں کی شراکت اور معاونت رہی۔ حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی نے 20۔ فروری 1968ء کو وفات پائی۔ وہ زندہ ہوتے تو معلوم نہیں اس کتاب کے مندرجات اور اندازِ تحریر سے اتفاق فرماتے یا نہ فرماتے، تاہم یہ کچھ بھی ہے، میں اس کا انتساب انہی رفیع المنزلت عالم و محقق کی طرف کرتا ہوں۔

محمد اسحاق بھٹی

ترتیب

مولانا عبدالخالق مدنی (کویت)

پیش گفتار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام على سيد الانبياء والمرسلين نبينا محمد وعلىٰ آله وصحبه اجمعين ومن تبعهم با حسان الى يوم الدين.

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے۔

"من لم يشكر الناس لم يشكر الله."

"جو لوگوں کا ممنون احسان نہیں ہوتا، وہ اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بھی نہیں ہوسکتا۔"

(الجامع الصغیر: 5641)

تذکرۂ اسلاف سے جہاں تاریخی حقائق سے آگاہی ہوتی اور جماعتوں کی تاریخ رقم کی جاتی ہے، وہاں اس سے روحوں کو جلا ملتی، عزائم جواں ہوتے اور طرزِ اسلاف کو اپنانے کے لیے جذبۂ صادقہ بیدار ہوتا ہے۔

مؤرخ اہل حدیث مولانا محمد اسحاق بھٹی متعنا اللہ بطول حیاتہ اپنے اسلاف واکابرین کے سوانح حیات اور زندگی کے احوال وواقعات کو بڑے حسین پیرائے میں مرتب کر کے ایسی قابلِ قدر خدمت سرانجام دینے میں مصروف ہیں کہ جس کی ماضی قریب میں نظیر نہیں ملتی، کیوں کہ وہ اس عمل جلیل اور زریں کارنامے کی اہمیت سے بخوبی آگاہ ہیں، جیسا کہ وہ خود رقم طراز ہیں: "زندہ و بااصول اور منظّم و باقاعدہ جماعتیں اپنی ابتدائی تاریخ اور اولیں ریکارڈ ہر قیمت پر محفوظ رکھتی ہیں، اور اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع نہیں ہونے دیتیں۔"

(ہفت اقلیم صفحہ 35)

تاریخ نویسی اور خاکہ نگاری ان کا فطری ذوق ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

''اصل بات یہ ہے کہ میں خود پرانا آدمی ہوں اور پرانے لوگوں سے تعلقات قائم کرنے اور قائم رکھنے کا عادی ہوں، ان کی باتیں بڑے غور سے سنتا ہوں اور پھر انھیں یاد رکھنا ضروری سمجھتا ہوں، ان کی صحبت ورفاقت میں بیتے ہوئے لمحات کو زندگی کی قیمتی متاع قرار دیتا ہوں، یہی وجہ ہے کہ بہت سے پرانے لوگوں کے چھوٹے موٹے بہت سے واقعات میری لوحِ ذہن پر مرتسم ہیں جن کو بیان کرنے سے بے حد خوشی محسوس کرتا ہوں۔''

(ہفت اقلیم صفحہ 98)

محترم بھٹی صاحب وقائع نگاری اور تاریخ نویسی کے اصول وضوابط کو جس اہتمام سے ملحوظ رکھتے اور ان کی پابندی کرتے ہیں، اس کا اندازہ ان کے اس بیان سے لگایا جاسکتا ہے۔

''تاریخ کا یہ ایک بنیادی اصول ہے کہ اس کے واقعات ایک خاص انداز اور رفتار سے اپنا سفر طے کرتے ہیں، اس میں خلل ڈالنا اور اسے بدل کر اپنی مرضی کے مطابق چلانے کی سعی کرنا اس کے مزاج وفطرت کے قطعاً منافی ہے۔'' (ہفت اقلیم صفحہ 366)

وہ کامل احتیاط اور جدوجہد کے ساتھ حقائق کو منظر عام پر لاتے ہیں، لیکن اس کے باوجود ان کا یہ بیان بھی ملاحظہ فرمایے جو ان کی تواضع کا ثبوت اور عظمت کی دلیل ہے۔

''کاروانِ سلف'' کے مقدمے میں لکھتے ہیں: ''میں نے اپنی کسی تحقیقی اور تحریری کاوش کو کبھی حرفِ آخر نہیں سمجھا۔ ہر لکھنے والے سے لغزشِ قلم اور لغزشِ فکر ہوسکتی ہے، مجھ سے بھی ہوسکتی ہے اور ہوتی ہے۔ اس کتاب میں بھی بے حد احتیاط کے باوجود کہیں نہ کہیں میں نے ضرور ٹھوکر کھائی ہوگی۔ اگر کسی صاحب کو اس میں کوئی اچھی بات نظر آئے تو اسے محض اللہ کا فضل قرار دیا جائے کہ اس نے مجھے اظہار وبیان کی توفیق مرحمت فرمائی اور اگر کہیں کوئی نقص دکھائی دے تو اسے میری کوتاہی اور کم نظری پر محمول کیا جائے۔'' (کاروان سلف صفحہ 12، 13)

بھٹی صاحب، جس ذوق وشوق سے اپنے اکابرین کی مساعیٔ جمیلہ کو اجاگر کرتے اور

ان کے تذکارِ حسین کو جس سلیقے اور قرینے سے قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں، اس کا اندازہ ان کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے۔

''میں نے اپنے طور پر اس کتاب کے صفحات میں علمائے اہل حدیث کی ایک چھوٹی سی کہکشاں سجانے کی کوشش کی ہے۔ اس کہکشاں کے ہر تارے نے اندھیروں میں اجالا کیا اور ظلمات کو روشنی بخشی ہے۔ ان سے استفادہ کرنے والے حضرات اس روشنی کی حدود کو اپنے انداز سے برابر آگے بڑھا رہے ہیں، میں اس کوشش میں کہاں تک کامیاب رہا ہوں، اس کا فیصلہ خوانندگان محترم کے ذوق مطالعہ پر چھوڑتا ہوں۔'' (کاروان سلف صفحہ 12)

الحمدللہ! وہ یقیناً اس عظیم کاوش میں کامیاب ہیں اور ان کی مساعی قابل رشک ہیں، اور جس عمدہ اسلوب اور خوبی سے انھوں نے وقائع نگاری کی ہے، اسے پڑھتے ہوئے ان کا قاری یوں محسوس کرتا ہے کہ وہ اسی دور میں رہ رہا ہے اور انہی شخصیات کے درمیاں موجود ہے۔ مختلف لوگوں کے عرف و عادات، مختلف مقامات کے جغرافیائی و موسمی احوال اور سیاسی و معاشرتی کوائف اور وجوہِ تسمیہ جیسی نادر معلومات فراہم کر کے وہ قارئین کرام کی معلومات میں اضافے کا سامان پیدا کرتے ہیں، کیوں کہ انھیں یقین ہے: ''اگر آئینہ قلب صاف ہو اور نیت زنگ آلود نہ ہو چکی ہو تو قدم خود بخود کامرانی کی طرف بڑھنے لگتے ہیں اور مستقبل کی راہ بہت جلد متعین ہو جاتی ہے۔'' (نقوشِ عظمت رفتہ صفحہ 266)

قارئین کرام! ہمارے بہت سے نامور اکابرین اور جید علمائے عِظام جنھیں اللہ تعالیٰ نے بوقلموں اوصاف اور گوناگوں صلاحیتوں سے نوازا ہے، مختلف علوم وفنون میں مہارت تامہ رکھتے تھے، لیکن ان کے بعض اوصاف اور خوبیاں ان کی پہچان کی علامت بن گئی ہیں۔ مثلاً شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ کو لیجیے، کم وبیش دو سو بہترین کتب کی تصنیف اور اخبار ''اہل حدیث'' میں ہزاروں مضامین لکھنے کے باوجود ان کی پہچان فن مناظرہ میں ان کی وہ مہارت ہے، جو اور کسی کے حصے میں نہ آئی۔ شہید اسلام حضرت علامہ احسان الٰہی ظہیرؒ اردو

اردو عربی کے ایک صاحب طرز ادیب اور مصنف ہیں، لیکن ان کی پہچان کی علامت ان کی خطابت ہے کہ اپنے دور کے لاجواب خطیب ہونے کی بنا پر انھیں ''خطیب ملت'' کہا جاتا تھا۔ مولانا محمد صدیق کرپالوی شیخ الحدیث اور ایک کامیاب خطیب تھے لیکن اس کے باوجود ان کی پہچان کی علامت فن مناظرہ بن گیا تھا۔ اسی طرح حضرت مولانا احمد الدین گکھڑوی رحمہ اللہ ایک محقق عالم دین اور خطیب بھی تھے لیکن فنِ مناظرہ ان کی پہچان بن چکا تھا۔ جب ہم نے ہوش سنبھالا تو ہم حضرت مولانا حافظ عبدالقادر روپڑی h کے بارے میں بڑی بڑی کانفرنسوں اور جلسوں کے اشتہارات میں سلطان المناظرین کا لقب لکھا ہوا دیکھتے اور لوگوں کی زبان سے ''شیر بہادر، شیر بہادر، عبدالقادر، عبدالقادر'' کے نعرہ ہائے پُر جوش سنا کرتے تھے۔ اسی طرح مولانا احمد الدین گکھڑوی رحمہ اللہ کے شدید المعارضہ ہونے اور حاضر جوابی کے چرچے بھی سنتے تھے اور لوگ انھیں امام المناظرین اور استاذ المناظرین کے القاب سے یاد کیا کرتے تھے۔ بلاشبہ وہ جماعت اہل حدیث کے ممتاز مناظرین میں سے تھے، جیسا کہ مؤرخ اہل حدیث تحریر فرماتے ہیں۔

''مسلک اہل حدیث سے وابستہ مناظر حضرات کی وسیع فہرست میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا محمد بشیر سہسوانی، مولانا محمد ابرہیم میر سیالکوٹی، مولانا ابوالقاسم بناری، مولانا احمد الدین گکھڑوی، حافظ عبدالقادر روپڑی، مولانا عبداللہ معمار، مولانا نور حسین گھرجاکھی (رحمہم اللہ) اور دیگر متعدد بزرگانِ دین شامل ہیں۔''

(قافلہ حدیث صفحہ 492)

دوسرے بہت سے اکابرین کی طرح مولانا گکھڑوی مرحوم کی، جدوجہد سے بھرپور زندگی کے بہت سے گوشے عصر حاضر کے زیادہ تر لوگوں کی نگاہ سے اوجھل تھے۔ ان کی حاضر جوابی، طرز استدلال اور زور بیان کے واقعات سننے والا ہر شخص متمنی تھا کہ اپنے دور کی اس عبقری شخصیت کے حالات زندگی سے آگاہی حاصل کرے۔ اللہ تعالیٰ مؤرخ اہل

حدیث مولانا محمد اسحاق بھٹی کو جزائے خیر عطا فرمائے کہ انھوں نے یہ عظیم کارنامہ سرانجام دے کر جہاں تذکرۂ اسلاف میں ایک اور باب کا اضافہ کر دیا ہے، وہاں بہت سے شائقین کی تشنگی دور کرنے اور تسکین طبع کا سامان بہم پہنچانے کا اہتمام بھی کر دیا ہے۔

اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ اپنی بہترین جزاؤں سے نوازے کویت میں مرکز دعوۃ الجالیات کے رئیس برادر مکرم عارف جاوید محمدی صاحب کو جو کہ اس کارِ خیر کی تکمیل کے اصل محرک ہیں۔ انھوں نے بڑی دلچسپی اور کامل رغبت کے ساتھ اس موضوع کی متابعت کی اور بہ اصرار بھٹی صاحب سے اس کتاب کی ترتیب و تکمیل کا مطالبہ جاری رکھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علمائے اہل حدیث کی خدمات اور زریں کارناموں سے متعلق معلومات جمع کرنے اور ان کی علمی خدمات کی اشاعت کا اہتمام کرنے کا انھیں جنون کی حد تک شوق ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے بہت سی معلومات جمع کر رکھی ہیں جو ان کے ''عجائب خانہ'' میں موجود ہیں۔ اسی طرح ''اجازۃ الروایۃ'' سے متعلق مسند علمائے کرام کے بارے میں ان کے پاس ایسی معلومات ہیں جو کہ میری ناقص رائے کے مطابق شاید ہی کسی اور کے پاس ہوں۔ حال ہی میں ان کی کوششوں سے ''اهل حديث في شبه القارة الهندية وعلاقتهم بالملكة العربية السعودية وغيرها من الدول'' کے نام سے ایک کتاب مکمل ہوئی ہے اور ماشاء اللہ اب زیر طبع ہے، جس کا مواد انھوں نے فراہم کیا ہے، لیکن اس کی ترتیب وتقدیم اور تعریب کا کام نامور علمی شخصیت فضیلۃ الشیخ صلاح الدین مقبول احمد حفظہ اللہ نے کیا ہے۔ علاوہ ازیں اس کتاب کی تکمیل کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مولانا احمد الدین گکھڑوی رحمہ اللہ کے ساتھ مولانا عارف جاوید محمدی کا قرابت داری کا تعلق بھی ہے۔ وہ مولانا سے اپنے تعلقات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''مولانا احمد الدین رحمہ اللہ سے بالمشافہ ملاقات مولانا کے بھتیجے محمد یعقوب کی شادی پر قلعہ دیدار سنگھ میں ہوئی۔ اس شادی میں نکاح مولانا احمد الدین صاحب نے خود پڑھایا تھا

اور دلہن ہمارے قریبی عزیزوں میں سے تھیں۔ مولانا انتہائی سادہ مزاج اور کم گو تھے۔ قمیص کے بٹن اکثر کھلے رکھتے اور تہبند باندھتے، سر پر بید کی ٹوپی اور ہاتھ میں لاٹھی......! جب بھی قلعہ میں تشریف لاتے تو اگر جمعہ کا دن ہوتا تو خطبہ جمعہ وہی ارشاد فرمایا کرتے، اور اگر جمعہ کے علاوہ کسی دن تشریف لاتے تو درس قرآن ضرور ارشاد فرماتے۔ ایک دفعہ مولانا ایک شادی میں شرکت کے لیے قلعہ دیدار سنگھ تشریف لائے تو بطور تکریم وہ لوگوں کے آگے آگے تھے اور ان کی لاٹھی میں نے (عارف جاوید محمدی نے) پکڑی ہوئی تھی۔ شادی والے گھر گئے تو وہاں نکاح خوانی کے لیے اس نواح کے حنفی عالم دین قاضی عصمت اللہ مدعو تھے۔ جب مولانا وہاں پہنچے تو قاضی صاحب نے جلدی جلدی نکاح پڑھایا اور فوراً وہاں سے رخصت ہو گئے۔

نکاح کے بعد مولانا نے پوچھا: ''کیا عصمت اللہ چلے گئے ہیں؟''

میں نے جواب دیا: ''جی ہاں! وہ تشریف لے گئے ہیں۔''

فرمانے لگے: ''اس نے چلے ہی جانا تھا، کیوں کہ اسے پتا چل گیا تھا کہ احمد الدین آ گیا ہے۔''

اس کی وجہ یہ تھی کہ مولانا احمد الدین کی تمام مسالک کے علما پر ایک ہیبت تھی اور رعب تھا۔

مولانا گکھڑوی کے علمی شغف اور اہل علم سے وابستگی کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا عارف جاوید محمدی بیان کرتے ہیں کہ جب مولانا عبدالخالق قدوسی h کویت تشریف لائے تو اثنائے گفتگو میں مولانا گکھڑوی مرحوم کا ذکر خیر آ گیا۔ مولانا قدوسی نے فرمایا: ''وہ میرے ہم جماعت تھے۔''

میں نے تعجب سے پوچھا: ''وہ آپ کے ہم جماعت کیسے ہو سکتے ہیں؟''

قدوسی صاحب نے فرمایا: ''جب ہم حضرت العلام حافظ محمد محدث گوندلوی رحمہ اللہ

سے سراجی (علم فرائض) کا درس لیا کرتے تھے تو اس دوران مولانا گکھڑوی بھی شریک درس ہوا کرتے تھے اور بڑے انہماک سے درس سنا کرتے تھے۔اس لحاظ سے وہ ہمارے ہم جماعت ہیں، اور مجھے اس پر فخر ہے۔'' پھر فرمانے لگے کہ میں نے مولانا گکھڑوی کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''الحمد للہ! مجھے کسی مناظرے میں شکست نہیں ہوئی۔''

عارف جاوید محمدی صاحب، شیخ الحدیث مولانا حافظ مسعود عالم حفظہ اللہ (جامعہ سلفیہ فیصل آباد) کے حوالے سے مولانا گکھڑوی کے ایک مناظرے کی روداد بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ'' حافظ مسعود عالم صاحب ملک حسن علی جامعی مرحوم کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ ''شرق پور کے قریب دریائے راوی کے کنارے ایک مقام ''موضع بھینی'' میں کسی زمانے میں قادیانی کافی تعداد میں آباد تھے،اور اس گاؤں میں دیوبندی مسلک کے بھی بہت سے گھرانے سکونت پذیر تھے۔ایک دفعہ فریقین کے مابین مناظرہ طے ہوا،تو دیوبندی حضرات نے قادیانی مناظر کے مقابلے میں جالندھر سے ممتاز عالم دین مولانا خیر محمد جالندھری (معروف عالم دین مولانا قاری محمد حنیف جالندھری کے والد گرامی) کو بلایا۔دو تین دن مناظرہ جاری رہا لیکن کوئی فیصلہ نہ ہو سکا، بالآخر وہاں کے لوگوں نے مشورہ دیا کہ اہل حدیث عالم دین مولانا احمد الدین گکھڑوی کو دعوت دی جائے۔چنانچہ مولانا احمد الدین مرحوم کو بلایا گیا اور مولانا نے اللہ کے فضل سے مناظرہ جیت لیا اور قادیانیوں کو شکست فاش ہوئی۔لوگ جب فاتحانہ جلوس کی شکل میں بھینی سے شرق پور آئے تو نماز مغرب کا وقت ہو چکا تھا۔سب نے عقیدت واکرام سے مولانا احمد الدین گکھڑوی کو امامت کے لیے اصرار کیا اور مولانا نے نمازِ مغرب کی امامت کرائی۔لیکن وائے افسوس! ''محترم مولانا خیر محمد جالندھری مرحوم نے ان کی اقتدا میں نماز نہیں پڑھی اور فرمایا کہ میں غیر مقلد کے پیچھے نماز نہیں پڑھ سکتا۔''

زیرِ نظر کتاب میں مؤرخ اہل حدیث مولانا محمد اسحاق بھٹی نے بڑے سلیقے اور ادبی

اسلوب سے امام المناظرین مولانا احمد الدین گکھڑوی رحمہ اللہ کی سوانح نگاری فرمائی ہے۔
یہ کتاب پونے تین سو سے زاید صفحات میں پھیلے ہوئے پچیس ابواب پر مشتمل ہے، جن میں حضرت مولانا گکھڑوی کی زندگی کے تمام علمی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہم اس عظیم کارنامے کی انجام دہی پر بھٹی صاحب کو مبارک باد پیش کرتے ہیں اور تاریخ اہل حدیث میں ایک زریں باب کے اضافے پر ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح ہم لجنۃ القارۃ الھندیہ کویت کے رئیس فضیلۃ الشیخ ابو خالد فلاح خالد المطیری حفظہ اللہ اور محترم شیخ عارف جاوید محمدی رئیس مرکز دعوۃ الجالیات کویت کے بھی شکرگزار ہیں کہ جن کی خصوصی توجہ اور دلچسپی سے ہمیں ایک اہم اور عظیم شخصیت کے حالات زندگی سے آگاہی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کو اپنی نیک جزاؤں سے نوازے۔ آمین

آخر میں یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ بھٹی صاحب نے ماشاء اللہ کتابیں تو بہت لکھی ہیں لیکن لجنۃ القارۃ الہندیہ کے لیے اب تک ان کی پانچ کتابیں شائع ہوئی ہیں جو نہایت اہم ہیں اور مندرجہ ذیل ہیں۔

پہلی کتاب ''برصغیر میں اہل حدیث کی آمد'' کے نام سے موسوم ہے۔ یہ اپنی نوعیت کی اولیں کتاب ہے جو 338 صفحات پر مشتمل ہے۔

دوسری کتاب ''برصغیر کے اہل حدیث خدام قرآن'' ہے۔ سات سو صفحات میں پھیلی ہوئی اس کتاب میں برصغیر کے ان 185 حضرات کا تذکرہ کیا گیا ہے، جنھوں نے اردو، فارسی، انگریزی، پشتو، بلوچی، سندھی، پنجابی، سرائیکی، ہندی وغیرہ زبانوں میں بہ صورت نظم یا نثر پورے قرآن یا قرآن کے کسی حصے کا ترجمہ کیا یا اس کی تفسیر لکھی۔ یہ نہایت محنت طلب کام ہے جو بھٹی صاحب نے کیا۔ ہر مترجم اور مفسر کے ضروری حالات بھی لکھے گئے ہیں۔

تیسری کتاب جو بھٹی صاحب نے تصنیف فرمائی ''دبستان حدیث'' ہے۔ یہ کتاب بڑے سائز کے 673 صفحات پر محیط ہے۔اس میں برصغیر کے ان ساٹھ حضرات کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں، جنھوں نے تصنیفی اور تدریسی صورت میں نبی ﷺ کی حدیث کی خدمت کی۔

چوتھی کتاب ''گلستان حدیث'' ہے۔اس میں بھی خدام حدیث کا تفصیل سے تذکرہ کیا گیا ہے۔

پانچویں کتاب یہی ''استاذ المناظرین مولانا احمد الدین گکھڑوی'' ہے جو قارئین کرام کے زیر مطالعہ ہے۔

چھٹی کتاب ''چمنستان حدیث'' کے نام سے زیر تصنیف ہے۔ان شاء اللہ یہ بھی جلد ہی خوانندگانِ محترم کی خدمت میں پیش کر دی جائے گی۔

خادم العلم والعلماء

عبدالخالق بن محمد صادق (کویت)

7۔جنوری 2011ء

......☆☆☆

حرفے چند

مولانا احمد الدین گکھڑوی نے جس خاندان میں جنم لیا اور جس گھرانے میں شعور کی دہلیز پر قدم رکھا، اس خاندان میں صالحیت کے آثار تو موجود تھے، لیکن خاندان کے کسی فرد کو علم سے شناسائی نہ تھی۔ احمد الدین اس خاندان کے پہلے اور واحد فرد تھے، جنھوں نے اپنی ذاتی کوشش اور بھاگ دوڑ سے حصول علم کی راہ اپنائی اور پھر ان کے سلسلۂ تقریر و خطابت اور مناظرات نے وہ رنگ باندھا کہ اس سے ایک دنیا متاثر و محظوظ ہوئی۔ جہاں گئے کامیابی نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔

بے شک وہ مصنف بھی تھے اور انھوں نے جو کتابیں تصنیف کیں، وہ اپنے موضوع کی نہایت تحقیقی کتابیں ہیں، جن کا تذکرہ اس کتاب کے ایک مستقل باب میں کیا گیا ہے اور آئندہ صفحات میں قارئین کے مطالعہ میں آئے گا۔ حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی مرحوم جیسے جلیل القدر عالم و محقق نے ان پر تقریظیں لکھیں۔ لیکن ان کی شہرت کا اصل باعث ان کے مناظرے اور مباحثے ہوئے اور تقریر و خطابت کا وہ خاص انداز ہوا جو انھوں نے اختیار کیا۔ وہ متحدہ ہندوستان کا زمانہ تھا اور تمام مذاہب و مسالک کے لوگ اس ملک میں آباد تھے۔ ان کے اہل علم کے درمیان مباحثوں اور مناظروں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ لوگ دیکھتے تھے کہ کہیں ہندو مذہب سے تعلق رکھنے والے آریہ سماجی اور سناتن دھرمی باہم ٹکرا رہے ہیں، کہیں مسلمان اور آریہ سماجی مناظر پنجہ آزمائی میں مشغول ہیں، کہیں عیسائی پادریوں اور مسلمان عالموں میں سلسلۂ بحث جاری ہے، کہیں مرزائی اور مسلمان ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرا ہیں، کہیں اہلِ حدیث اور بریلوی حضرات آمنے سامنے سٹیج

سے دلچسپ اور مذہبی لحاظ سے معلومات افزا دور تھا، جس میں جگہ جگہ علم کی ورزش اور تحقیق کی کشتی کے اکھاڑے جمے ہوئے تھے۔ اس دور میں ایک عجیب تر اور مسرت آمیز بات یہ تھی کہ ہر طرف کے لوگ نہایت اطمینان وتحمل اور ہنسی خوشی سے ایک دوسرے کی باتیں سنتے تھے۔ کسی جانب سے کسی قسم کی ہنگامہ آرائی نہیں ہوتی تھی۔ نہ مناظرے سے پہلے کوئی فریق کسی فریق سے جھگڑتا تھا، نہ اثنائے مناظرہ میں کسی جانب سے سختی کی فضا پیدا کی جاتی تھی اور نہ مناظرے کے بعد ہاتھا پائی تک نوبت آتی تھی۔ بات علمی لحاظ سے افہام وتفہیم کے دائرے میں رہتی تھی۔ اس سے آگے نہیں بڑھتی تھی۔ لڑائی جھگڑا کرنے والوں کو شکست خوردہ سمجھا جاتا تھا اور کہا جاتا تھا کہ یہ لوگ علمی بات کا جواب علمی اسلوب میں نہیں دے سکتے، اس لیے لڑائی جھگڑے پر اتر آئے ہیں۔

مولانا احمد الدین گکھڑوی اگرچہ طالب علمی کے زمانے میں بھی اپنے مذہب ومسلک کے مخالفین سے بحث ومباحثہ جاری رکھتے تھے، لیکن تعلیم سے فراغت کے بعد وہ باقاعدہ طور سے 1920ء کے پس وپیش مناظرے اور تقریر کے میدان میں اترے۔ پھر عیسائیوں، شیعوں، مرزائیوں اور بریلویوں سے ان کے بے شمار مناظرے ہوئے اور اس زمانے میں ان کے مناظروں کی سامعہ نواز گونج دور دور تک سنی گئی۔ لیکن اتنے بڑے اور کامیاب مناظر کے تاریخی طور سے ترتیب وار مناظرات کی تفصیل ہمارے علم نہیں آتی۔ میرے خیال میں اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ نہ ان کے رشتے داروں میں کسی شخص کو علم ودانش سے اتنا تعلق تھا کہ وہ ان کے مناظرات ومباحث کے اہم نکات خاص ترتیب سے ضبطِ تحریر میں لاسکتا، نہ ان کے کسی دوست اور شاگرد نے اس پر غور کیا اور نہ خود ان کا اپنا دھیان اس طرف گیا کہ تاریخ وار ان مناظرات کی روداد قلم بند کی جائے۔ اس دور میں ذرائع ابلاغ کا بھی اتنا پھیلاؤ نہ تھا اور جماعت اہل حدیث کے بھی زیادہ اخبار نہ تھے۔ پورے برصغیر میں صرف دو تین ہفت روزے اور ماہنامے ہوں گے۔ ان میں ان کے مناظروں کے تمام ضروری اور بنیادی پہلو

ضبطِ تحریر میں نہیں آسکتے تھے۔ پھر مناظرے بھی جگہ جگہ ہورہے تھے اور مسلسل ہورہے تھے، اخباروں میں کس کس مناظرے کا ذکر کیا جاتا۔ اسے لوگ معمول کا واقعہ قرار دیتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ ان کی جوانی کا دور تھا اور جوانی میں بے پروائی کا عنصر ہمیشہ غالب رہتا ہے۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ وہ درویش منش مناظر تھے۔ ہر مناظرے میں ان کا مقصد کتاب وسنت کی تبلیغ اور اپنے مسلک کی حقانیت کا اظہار واثبات ہوتا تھا، اور وہ مقصد نہایت اچھے طریقے سے حاصل ہوجاتا تھا۔ حالات بتاتے ہیں کہ انھوں نے اس مسئلے پر کبھی غور نہیں فرمایا کہ مذہبی طور پر ان کے مناظرے خاص تاریخی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی حفاظت ضروری ہے۔ یہ محفوظ رہیں گے تو آئندہ نسل ان سے فائدہ اٹھائے گی۔ وہ ہر مناظرے کو ایک وقتی اور ہنگامی تبلیغی معاملہ سمجھتے رہے اور اسی پر عمل پیرا رہے۔

میں نے چھوٹی عمر میں تقسیم ملک سے بہت سال پہلے ان کے دو مناظرے سنے تھے۔ ایک مناظرہ دیہات میں جمعہ پڑھنے کے متعلق ضلع فیروز پور کے ایک گاؤں میں بریلوی عالم مولانا محمد حسین (ساکن گوندلاں والا) سے ہوا تھا اور دوسرا مناظرہ انھوں نے ضلع فیروز پور ہی کے مشہور تدریسی مرکز ''لکھوکے'' کے قریب موضع ڈھنڈیاں میں مولانا حافظ عبدالستار دہلوی سے کیا تھا۔ ان دونوں مناظروں کی تفصیل مجھے یاد ہے، جس کے بعض اہم حصے آئندہ صفحات میں خوانندگانِ محترم کے مطالعہ میں آئیں گے۔

ان کے وہ رفقائے کرام اور علمائے عظام جو مختلف مقامات کے جلسوں اور مناظروں میں ان کے ساتھ رہے، وہ ان کی تقریروں اور مناظروں کی تحسین تو کرتے ہیں، لیکن ان کی تفصیل ان میں سے کوئی صاحب بیان نہیں فرماتے۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ ان کے مناظروں کی تفصیل کیوں بیان نہیں کی گئی؟ مولانا حافظ عبدالقادر روپڑی کے بقول وہ استاذ المناظرین تھے۔ استاذ المناظرین کے مناظروں کے موضوع اور ان کی تفصیل ضبطِ تحریر میں آنا چاہیے تھی۔

معلوم ہوتا ہے زندگی کے آخری دور میں انھیں یہ احساس ہوگیا تھا کہ انھوں نے خطابتی اور مناظراتی صورت میں جو خدمات سرانجام دی ہیں، وہ تحریری طور پر بھی محفوظ ہو جانی چاہئیں، چنانچہ اپنے آخری ایام مرض میں وفات سے کچھ دن پہلے انھوں نے اخبار ''الاعتصام'' کے عملۂ ادارت کے مرحوم رکن مولانا محمد سلیمان انصاری کو خط لکھا اور ان سے ملاقات کی خواہش ظاہر فرمائی۔ مولانا محمد سلیمان انصاری ان کی خدمت میں گکھڑ گئے تو انھوں نے اس قسم کی باتیں کیں کہ ہماری جماعت کے نوجوانوں کو اپنے بزرگوں کے کارنامے جمع کرنے کا شوق نہیں ہے۔ اپنے خاندان کے نوجوانوں کے متعلق کہا کہ حصول علم کی طرف ان کی توجہ نہیں۔

مولانا محمد سلیمان انصاری سے انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ موجودہ دور کے علماء ہم جیسے تجربہ کار لوگوں سے استفادہ نہیں کرتے، حالاں کہ ہماری باتیں ہمارے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد انہی کے کام آنے والی ہیں۔

ظاہر ہے اس قسم کی گفتگو کا مطلب یہی تھا اور بالکل صحیح تھا کہ انھوں نے اپنے طور پر جماعت کی جو خدمت کی ہے، افادۂ عام کے لیے اسے کسی صورت میں محفوظ و مرتب کیا جائے۔ مولانا محمد سلیمان انصاری بھی عرصہ ہوا دنیا سے رخصت ہو گئے...... یہ ایک المیہ ہے کہ جس انداز اور جس سلیقے سے کتابی صورت میں یا مضامین کی صورت میں مولانا احمد الدین کے حالات و خدمات مرتب ہونا چاہئیں تھے، کسی صاحب نے نہ کیے۔ اس کتاب میں یہ خلا پُر کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ان شاء اللہ قارئین کو اس سے کافی مواد مل جائے گا۔

قابل غور بات یہ ہے کہ زندگی کے آخری دور میں مولانا احمد الدین نے اپنے کسی پرانے ساتھی کو اپنے ہاں تشریف لانے کی دعوت نہیں دی۔ جن حضرات کی رفاقت میں وہ مختلف مقامات کے جلسوں اور مناظروں میں شرکت فرماتے رہے، ان میں سے کسی کو خط لکھ

کر نہیں بلایا۔ اپنے سے بہت کم عمر ایک جماعتی اخبار کے رکن کو بلایا جو کبھی ان کے ساتھ کسی جلسے یا مناظرے میں نہیں گئے ہوں گے۔ اس کی وجہ شاید یہی تھی کہ ان کے مناظرات کے اہم پہلوؤں کو حیطۂ تحریر میں لا کر اخبار میں شائع کیا جائے تاکہ لوگ ان سے استفادہ کر سکیں۔ لیکن حالات کی رفتار کچھ ایسی رہی کہ مولانا محمد سلیمان انصاری کو بھی ان کے واقعات حیات اور مناظرات کے اہم پہلوؤں کو جمع کرنے اور ترتیب دینے کی فرصت نہ ملی اور پھر اس ملاقات کے چند روز بعد خود مولانا احمد الدین بھی اس دنیا کو چھوڑ کر عالمِ آخرت میں جا پہنچے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اپنی تاریخ کو بھلا دیا ہے یا اس سے بے رخی اختیار کر لی ہے۔ ہمارے اسلاف نے جو تحریری، تصنیفی، مناظراتی اور تدریسی خدمات سرانجام دیں، ہم بہت حد تک اس سے ناآشنا ہیں۔ ہمارے وہ بزرگ جو تمام عمر تصنیف و تالیف میں مصروف رہے، جنھوں نے بے شمار لوگوں کو علم کی دولت سے مالا مال کیا اور جن کے شب و روز خطابت و مناظرات کی صورت میں تبلیغ دین میں بسر ہوئے، ان میں سے کتنے ہی بزرگوں سے ہم نے رشتہ توڑ لیا ہے۔ ان کی زندگیوں میں ان کی جہدِ مسلسل کے جو نقوش ہر آن ابھرے رہے، ہماری عدم توجہ سے اب وہ نقوش مدھم پڑ گئے ہیں۔ ان بزرگانِ عالی مرتبت میں سے ایک جلیل المنزلت شخصیت انہی مولانا احمد الدین گکھڑوی کی تھی۔ ان کی وفات پر ابھی چالیس برس بھی نہیں گزرے اور ان سے ملنے والے بہت سے اصحابِ علم اللہ کی مہربانی سے موجود ہیں، لیکن ہماری حرماں نصیبی ملاحظہ ہو کہ ہم ان کی خدماتِ دینی کی تفصیل سے پوری طرح واقف نہیں۔ کچھ اور بزرگ بھی ہیں جو ہماری لوحِ ذہن سے تقریباً محو ہو گئے ہیں۔ مثال کے طور پر مولانا عبداللہ معمار اور حبیب اللہ کلرک کو لیجیے۔ ان دونوں کا تعلق امرتسر سے تھا اور مرزائیت کی مخالفت میں انھوں نے جو تحریری مواد جمع کیا اور خاص ترتیب کے ساتھ شائع کرایا، وہ بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ مولانا عبداللہ معمار مزدوری کرتے اور

لوگوں کے مکان بناتے تھے۔ اپنی مزدوری کے اوقات سے وقت نکال کر وہ مرزائیوں سے مناظرے بھی کرتے تھے اور اس موضوع پر کتابیں بھی لکھتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کی ایک مشہور اور ضخیم کتاب ''محمدیہ پاکٹ'' ہے، جو تقسیم ملک سے پہلے بھی چھپی اور بعد میں بھی چھپی۔ مرزائیت کے بارے میں یہ کتاب کتب حوالہ میں سے ہے۔ لیکن مولانا عبداللہ معمار کا کبھی کسی نے تذکرہ نہیں کیا۔ وہ 1950ء میں فوت ہوئے تھے اور میں نے انہی دنوں ''الاعتصام'' میں ان پر مضمون لکھا تھا۔ اس کے بعد کسی نے ان کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔

حبیب اللہ کلرک امرتسر میں محکمۂ انہار میں کلرک تھے۔ مرزائیت سے متعلق بہت معلومات رکھتے تھے۔ اس سلسلے کے وہ بہت بڑے مقرر بھی تھے اور کئی اہم رسائل کے مصنف بھی تھے۔ تقسیم ملک سے قبل ان کی بڑی شہرت اور بہت مانگ تھی۔ لیکن اب ہماری یادوں کے کسی ورق کی کسی سطر میں کہیں ان کا نام اور کام دکھائی نہیں دیتا۔ مولانا محمد ابراہیم خادم، مولانا علی محمد صمصام اور مولانا حافظ اسماعیل روپڑی کے بارے میں بھی کسی صاحب کا کوئی قابلِ ذکر مضمون نہیں چھپا۔ اور بھی بہت لوگ ہیں، جن کی شخصیت سے ہم باخبر ہیں، اور ان کے حالات سے بے خبر ہیں۔

مولانا احمد الدین کی تو کوئی اولاد بھی نہ تھی اور ان کے قریبی رشتے داروں میں بھی کوئی شخص ایسی صلاحیت کا مالک نہ تھا جو ان کی زندگی میں یا ان کے بعد ان کے حالات قلم بند کرتا، جن علمائے ذی مرتبت کے اخلاف کو اللہ تعالیٰ نے علم و عمل کی نعمتِ بے بہا سے نوازا ہے اور وہ قلم و قرطاس کے فن سے بھی آگاہ ہیں، وہ بھی اپنے آبا و اجداد کے حالات لکھنے میں متامّل ہیں۔ میں اس باب میں کسی اہل علم کو مطعون نہیں ٹھہراتا۔ نہ میرا یہ مطلب ہے کہ ان کے اخلاف میں سے کسی وجہ سے کوئی شخص یہ خدمت سرانجام نہیں دے سکا تو کوئی اور بھی نہ دے۔ وہ اہلِ علم بزرگ یقیناً ہمارے بھی بزرگ تھے۔ ہم نے ان سے فیض حاصل کیا ہے اور ان کی تصانیف اور ان کی اولاد کی مساعیٔ تدریس کے ذریعے سے اب بھی حاصل

کر رہے ہیں، ہم سب کا فرض ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ان کے حالات قلم بند کرنے کی کوشش کریں، چنانچہ یہ فقیر اپنے طور پر کسی نہ کسی نہج سے بزرگانِ دین کے احوالِ زندگی حوالۂ قلم کرنے کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ مولانا احمد الدین گکھڑوی کے متعلق بھی جو کچھ میسر آیا، لکھ دیا گیا۔

یہ ضروری نہیں کہ علمائے سلف کے ورثاء اپنے آباواجداد کے ہر کارنامے سے آگاہ ہوں اور دوسرے لوگ ان کے بارے میں بالکل ناواقف ہوں۔ جو کچھ کسی کو معلوم ہے اس کا بہتر طریقے سے اظہار کرنا چاہیے۔ بعض مشہور علمی خاندانوں کے اسلاف کے بعض اہم واقعات سے ان کے بہت لکھے پڑھے اخلاف آگاہ نہیں اور اللہ کے فضل سے یہ فقیر آگاہ ہے۔ میرا فرض ہے کہ میں ان اہم واقعات کو ذہن کے تہ خانے سے نکال کر کاغذ پر مرتسم کروں، اور بحمد اللہ حتی الامکان میں یہ کام کرتا رہتا ہوں، اور مجھے کرنا بھی چاہیے۔

میں ہرگز یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں سب کچھ جانتا ہوں اور کسی بزرگ کے بارے میں جو واقعات بیان کرتا ہوں، وہ سب واقعات مجھے حفظ ہیں۔ میں بھی کسی صاحب کے متعلق کچھ لکھتا ہوں تو بسا اوقات مختلف اہلِ علم سے روابط قائم کرتا ہوں اور پوچھ پوچھ کر اور بچ بچ کر اپنی دانست میں احتیاط سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کہیں غلطی بھی ہو جاتی ہے جو انسانی فطرت کا خاصہ بلکہ تقاضا ہے۔

مولانا احمد الدین گکھڑوی کے متعلق بھی جو کچھ لکھا گیا ہے، بہت سے دروازوں پر دستک دے دے کر لکھا گیا ہے اور یہ بھی ہمارے عزیز القدر دوست مولانا عارف جاوید محمدی (مقیم کویت) کی سعیِ پُرخلوص کا نتیجہ ہے۔ ان کی بار بار کی تاکید سے کچھ مواد جمع ہو گیا، جسے کتابی ''شکل'' دے دی گئی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس شکل میں کچھ جان بھی ہے یا نہیں؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اس کی نبض اب لائقِ احترام قارئین کے ہاتھوں میں ہے۔ وہی فیصلہ کریں گے کہ اس میں تھوڑی یا بہت جان ہے یا نہیں ہے۔

مولانا عارف جاوید محمدی کے بارے میں یہ بتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرحومین وموجودین علمائے کرام سے بے پناہ عقیدت ومحبت رکھتے ہیں اور ان کے واقعاتِ زندگی سے انھیں خاص دلچسپی ہے۔ یہ کتاب جیسی بھی ہے، ان کی عقیدت ومحبت او دلچسپی کی وجہ سے ہی معرضِ کتابت میں آئی ہے۔

اس کا مواد جمع کرنے میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے مینجر جناب محمد سلیم چینوٹی کی کوششوں کا بڑا دخل ہے۔ انھوں نے اخبار میں بھی بار بار اعلان کیا اور لاہور سے باہر جا کر بھی بعض حضرات سے ملاقات کی۔ جو کچھ کسی دوست سے ملا، کاغذ پر منتقل کر دیا گیا۔ اس سے خوانندگانِ محترم ان شاء اللہ اپنے پسند کی تھوڑی بہت چیزیں حاصل کر سکیں گے۔

حکیم عتیق الرحمٰن اور ڈاکٹر محمد یوسف فاروق نے بھی بڑی مدد کی۔ یہ دونوں بھائی ہمارے مخلص تریں عزیز دوست ہیں۔ حکیم عتیق الرحمٰن اس سلسلے میں گکھڑ بھی گئے اور گوجراں والا کا چکر بھی لگایا اور بعض لوگوں سے ملاقات کی۔ حکیم صاحب گوجراں والا جا کر مولانا محمد ابراہیم صاحب سے بھی ملے جو برادری میں مولانا احمد الدین کے بھتیجے ہیں۔ مولانا ممدوح سے انھیں جو معلومات حاصل ہوئیں، وہ اس کتاب میں درج ہیں۔ مولانا احمد الدین گکھڑوی کا رسالہ ''قدامت اہل حدیث'' بھی مجھے حکیم صاحب نے ارسال فرمایا۔ دونوں بھائی حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کے بھتیجے اور ہمارے مرحوم کرم فرما حکیم عبدالمجید صاحب کے فرزندانِ ذی قدر ہیں۔ ان کا ذکر آگے بھی آئے گا۔

مولانا احمد الدین کی تمام کتابیں حافظ محمد یوسف گکھڑوی مرحوم کے قائم کردہ سکول بک ڈپو گوجراں والا کی طرف سے شائع ہوئی تھیں۔ ان کے صاحب زادۂ گرامی جناب عطاء السلام صاحب سے ٹیلی فون پر بات ہوئی تو وہ 17۔ ستمبر 2010ء کو لاہور تشریف لائے اور مجھے مولانا احمد الدین کی دو کتابوں (برہان الحق اور سیرت سید العالمین ﷺ) کی فوٹو کاپیاں عنایت کیں۔ اس پر میں ان کا شکر گزار ہوں۔

گوجراں والا سے جناب شاہد فاروق ناگی نے بذریعہ ڈاک بھجوائی۔ اللہ انھیں خوش رکھے۔ جب بھی میں نے ان سے کوئی کتاب طلب کی، انھوں نے کسی نہ کسی طرح مہیا کر دی۔ جزاہ اللہ خیراً۔

مولانا محمد یوسف انور (خطیب جامع مسجد اہل حدیث امین پور بازار فیصل آباد) کے والد مکرم حاجی عبدالرحمٰن مرحوم علمائے کرام سے بے حد عقیدت سے پیش آتے تھے۔ تقسیم ملک سے قبل ان کا تعلقِ سکونت قصبہ پٹی (ضلع لاہور) سے تھا۔ تقسیم کے نتیجے میں یہ قصبہ ضلع امرتسر (مشرقی پنجاب ہندوستان) میں شامل ہوا۔ حاجی عبدالرحمٰن اپنے اہل و عیال سمیت پٹی سے فیصل آباد آگئے۔ پٹی میں بھی یہ اہل علم کو ذاتی مہمان قرار دے کر اپنے گھر ٹھہراتے تھے۔ فیصل آباد میں بھی ان کا یہی معمول رہا۔ مجھے اور مولانا محمد حنیف ندوی کو بھی وہ ایک مرتبہ اپنی دکان پر لے گئے تھے اور ہماری مہمان نوازی کی تھی۔ مولانا احمد الدین کا قیام اکثر ان کے گھر پر ہوتا تھا۔ میری درخواست پر مولانا کا تذکرہ حاجی صاحب مرحوم کے عالمِ دین فرزند مولانا محمد یوسف انور نے خاصی تفصیل سے کیا ہے۔ مولانا محمد یوسف انور سے میرے دوستانہ مراسم طویل مدت سے قائم ہیں۔ میں ان کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میری درخواست کو شرفِ قبول بخشا اور مولانا احمد الدین گکھڑوی سے متعلق بعض اہم باتوں سے آگاہ فرمایا۔ ان کی تحریر میں کچھ تبدیلی کر کے اسے کتاب کا الگ سے (سترھواں) باب بنا دیا گیا ہے۔

حافظ ریاض احمد عاقب (مدرس مرکز ابن القاسم الاسلامی ملتان) نے مولانا گکھڑوی کی عربی زبان کی ایک تقریظ بذریعہ ڈاک بھجوائی جو انھوں نے کسی زمانے میں حضرت سید بدیع الدین شاہ راشدی رحمۃ اللہ علیہ کی عربی کتاب ''المرآۃ لطرق حدیث من کان له امام فقرأۃ الامام له قراۃ'' پر تحریر فرمائی تھی۔ یہ کتاب ابھی تک چھپی نہیں۔

مولانا ارشاد الحق اثری کا شمار میرے بے تکلف عزیز دوستوں میں ہوتا ہے۔ وہ

مولانا ارشاد الحق اثری کا شمار میرے بے تکلف عزیز دوستوں میں ہوتا ہے۔ وہ جماعت اہل حدیث کے نامور محقق ہیں۔ بہت سی عربی اور اردو کتابوں کے مرتب و مصنف۔ انھوں نے مولانا احمد الدین صاحب کے چند واقعات لکھ کر بھجوائے جنھیں کتاب کا ایک مستقل (اٹھارھواں) باب بنا دیا گیا ہے۔

میرے دوست ملک عبدالرشید عراقی نے بھی چند واقعات لکھ بھیجے ہیں جو کتاب میں ایک باب کی صورت میں درج ہیں۔ عراقی صاحب جماعت اہل حدیث کے مشہور مصنف ہیں اور ان کے مضامین اخبارات میں بھی چھپتے رہتے ہیں۔

حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی (مدرس جامعہ سلفیہ فیصل آباد) کئی کتابوں کے مصنف اور بہت اچھے مقرر ہیں۔ مسلک اہل حدیث کی تبلیغ اور علمائے اہل حدیث کی خدمت ان کا معمولِ حیات ہے۔ پھر جو شخص کسی سطح پر اس عمل میں تھوڑا بہت حصہ لیتا ہے، اس سے یہ باقاعدہ رابطہ رکھتے ہیں۔ مجھ سے بھی ان کا یہی تعلق ہے۔ میں چوں کہ اپنی بساط کے مطابق کسی نہ کسی صورت میں یہ کام کرتا رہتا ہوں یا کرنے کی کوشش کرتا ہوں، اس لیے عزیز القدر حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی مجھ سے رابطہ رکھتے ہیں اور میں اس موضوع کے متعلق جو کام ان کے سپرد کروں، وہ اسے نہایت خوشی سے سرانجام دیتے ہیں۔ اس پر میں ان کا شکر گزار ہوں۔

پچھلے دنوں وہ میری درخواست پر موضع راہوالی (ضلع گوجراں والا) میں مولانا محمد رفیق سلفی کی خدمت میں گئے اور مولانا احمد الدین گکھڑوی کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کیں جو اس کتاب میں بائیسویں باب کی صورت میں مندرج ہیں۔

مولانا محمد رفیق جماعت کے رفیع المرتبت عالم اور ممتاز خطیب ہیں۔ انھوں نے راہوالی اور اس کے قرب و جوار میں کتاب و سنت کی تبلیغ کی اور اللہ کے فضل سے کر رہے ہے۔ ان کے مختصر حالات حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی نے لکھ بھیجے ہیں جو اس کتاب کے بائیسویں

باب میں مولانا احمد الدین گکھڑوی کے واقعات سے پہلے قارئین کے مطالعہ میں آئیں گے۔ اس پر میں حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی کا بھی شکرگزار ہوں اور مولانا محمد رفیق سلفی صاحب کا بھی۔ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ انھیں قرآن وحدیث کی خدمت کے زیادہ سے زیادہ مواقع عطا فرمائے اور علم واخلاص کی نعمت سے نوازے۔

یہ فقیر ان تمام حضرات کا بے حد شکرگزار ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

یہاں ایک اور عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ مولانا احمد الدین گکھڑوی اور بہت سے دیگر علمائے کرام نے اپنے اپنے انداز میں جماعت اہل حدیث اور مسلک اہلِ حدیث کی بے حد خدمت کی اور اسی خدمت میں عمر گزار دی، لیکن ان کی زندگی کے آخری دور میں جماعت کے کسی گروہ نے یہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کی کہ وہ کس حال میں ہیں، نہ کسی نے ان کے ایام مرض میں پتا کیا کہ ان کی مالی اور معاشی حالت کیسی ہے اور مسلک وجماعت کے یہ عمر بھر کے ہمہ وقتی خادم کس حال میں زندگی گزار رہے ہیں۔ اکثر اکابرِ جماعت نے تو کبھی ان کی عیادت کی ضرورت بھی محسوس نہ فرمائی۔

وہ نہایت خوددار اہلِ علم تھے۔ انھوں نے نہ کسی کو کبھی اپنی کسی ضرورت کے متعلق کچھ کہا، نہ کسی کے سامنے کبھی ایسا انداز اختیار کیا، جس سے ان کی کسی احتیاج کی طرف کسی قسم کے اشارے کا شبہ پڑ سکتا ہو۔

ان کے آخری ایامِ مرض میں خصوصیت کے ساتھ جماعت کے یکے بعد دیگرے دو اصحابِ علم نے ان سے ملاقات کی۔ پہلے مولانا ارشاد الحق اثری نے (جیسا کہ اس کتاب کے باب نمبر اٹھارہ (18) میں بتایا گیا ہے)۔ اس سے کچھ دن بعد مولانا محمد سلیمان انصاری مرحوم نے ان کی خدمت میں حاضری دی، جس کی ضروری تفصیل کا قارئین کرام کو کتاب کے آخر میں پتا چلے گا۔ ان ملاقاتوں کے مطالعہ سے ہمیں مولانا مرحوم کے ہر قسم کے

حالات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ ان کی مریضانہ حالت کا بھی پتا چل جاتا ہے اور معاشی حالت کا بھی علم ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے بھتیجوں کے ساتھ رہ رہے تھے اور بھتیجے خود مزدوری کر کے زندگی گزارتے تھے، ظاہر ہے وہ ان کی زیادہ خدمت کرنے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔ تاہم جو کچھ ان سے ہو سکا، وہ فراخ دلی سے کرتے رہے۔ سوال یہ ہے کہ اپنے جلسوں میں ان سے تقریریں اور مناظرے کرانے والے اس وقت کہاں تھے؟

مولانا محمد سلیمان انصاری نے لکھا ہے کہ میں ان کی خدمت میں گیا اور چند باتیں کیں۔ لیکن ان کے کوائف حیات تو ان کے ہم عصر حضرات ہی لکھ سکتے ہیں اور وہی لکھیں گے۔ مولانا سلیمان انصاری کی یہ بات بالکل صحیح ہے، مگر ان کے ہم عصر و ہم سفر، ہم تقریر و ہم مناظر اور ہم کلام و ہم مذاق حضرات میں سے ان کے متعلق کسی نے کچھ نہیں لکھا۔ وہ سب حضرات وفات پا چکے ہیں۔ اب اس بے اعتنائی کا شکوہ کس سے کیا جائے؟

یہاں یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ مولانا احمد الدین گکھڑوی سے میرا زیادہ تعلق نہ تھا۔ اسے میری دوں ہمتی سمجھیے یا بد نصیبی سے تعبیر کیجیے کہ میں خاص عزم کے ساتھ کبھی ان کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔ نہ کبھی استفادے کے لیے ان کی مجلس میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا۔ ان کی تقریریں بھی زیادہ نہیں سن سکا۔ تقسیم ملک سے کئی سال پہلے ان کے دو مناظرے ضرور سنے، جن میں سے ایک مناظرے کا ذکر زیرِ مطالعہ کتاب کے چھٹے اور دوسرے کا دسویں باب میں کیا گیا ہے۔ لیکن تقسیم ملک سے پہلے یا اس کے بعد جس طرح بہت سے اہل حدیث اور غیر اہل حدیث علمائے کرام سے میرا میل ملاقات کا سلسلہ رہا، اس طرح مولانا ممدوح سے نہیں رہا۔ اس کا ان کی زندگی میں تو احساس نہیں ہوا، البتہ اب ہو رہا ہے اور بہت ہو رہا ہے۔ اگر مجھے ان کی مجلسوں میں حاضری کے مواقع میسر آئے ہوتے تو میں ان کے متعلق کچھ دوسرے انداز سے لکھنے کی کوشش کرتا اور ان کے احوالِ زندگی جمع کرنے کے لیے مجھے زیادہ دوستوں کو زحمت دینے کی ضرورت نہ پڑتی۔ لیکن اب اس قسم کی باتیں

کرنے یا باتیں بنانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ بعد از مرگ واویلا ہے۔ بلاشبہ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہے۔ جب مقررہ وقت آ جاتا ہے تو کام ہو جاتا ہے۔ اس کام کا بھی وقت مقرر تھا اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اللہ کے فضل سے توقع سے کہیں زیادہ ہو گیا۔

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

اس کتاب کے لیے معلومات حاصل کرنے کی غرض سے متعدد دوستوں سے رابطہ قائم کیا گیا۔ ان دوستوں نے مہربانی فرمائی اور معلومات بہم پہنچائیں۔ بعض معلومات میں قدرے تکرار کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے، لیکن یہ تکرار فائدے سے خالی نہیں، اس لیے کہ دو تین مقامات میں جہاں تکرار کا احساس ہوتا ہے، وہاں معلومات میں کمی بیشی بھی پائی جاتی ہے۔ یعنی کوئی واقعہ ایک جگہ اختصار سے بیان ہوا ہے اور دوسری جگہ اسی واقعہ کی تفصیل آ گئی ہے، اس لیے اسے ایسی تکرار نہیں کہا جا سکتا جس سے قاری کے ذہن میں تکدر پیدا ہوتا ہو، بلکہ اسے ایک سے زائد راویوں کا بیان کردہ واقعہ قرار دیا جائے گا، کسی نے کم الفاظ میں بیان کر دیا، کسی نے زیادہ الفاظ میں۔! راویوں کا زیادہ ہونا واقعہ کی صحت پر دلالت کرتا ہے۔ لطیفے کے طور پر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ہم لوگ قرآن وحدیث پر عمل کے دعوے دار ہیں اور قرآن وحدیث میں بہت سے واقعات بہ تکرار بیان فرمائے گئے ہیں اور ہر تکرار میں موقع ومحل کے مطابق ایسا خوب صورت اور دلنشین انداز اختیار فرمایا گیا ہے کہ پڑھنے والا اس سے بے حد محظوظ ہوتا ہے اور نئے سے نئے مسائل سے آگاہی حاصل کرتا ہے۔ ہماری تکرار میں وہ بات تو ہرگز نہیں آ سکتی۔ لیکن تکرار کے جواز کا ثبوت مل جاتا ہے۔

یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ اس کتاب کی تکمیل میں دوستوں نے میری مدد تو کی، جس سے مانگا، اس نے انکار نہیں کیا، کچھ نہ کچھ دے دیا، لیکن سچی بات یہ ہے کہ مانگنا بہت مشکل ہے۔ گھر گھر کا دروازہ کھٹکھٹانا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ بعض لوگوں کے بارے میں یہ حسنِ ظن ہوتا ہے کہ وہ بڑے سخی ہیں، جاتے ہی کشکول بھر دیں گے، لیکن وہاں سے صاف

جواب ملتا ہے۔ بعض لوگ جھگڑنا شروع کر دیتے ہیں کہ اب آ گئے ہو۔ اب تک اس طرف کیوں توجہ نہیں کی۔ ان کے ہاں سے بجز ڈانٹ ڈپٹ کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ مگر مانگنے والا بھی ڈھیٹ ہوتا ہے، صاف جواب کے باوجود وہیں کھڑا رہتا ہے اور دعا کرتا ہے، جو دے اس کا بھی بھلا، جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔

اگر قارئینِ کرام کا ذوقِ تدین مجروح نہ ہو اور وہ تھوڑا سا خوش دلی کا مظاہرہ فرمائیں تو یہ عرض کرنے کی جسارت کروں کہ مانگنے والے کا معاملہ بسا اوقات رانجھے کا سا ہوتا ہے۔ ہیر کو جب کھیڑے جھنگ سے بیاہ کر رنگ پور کھیڑیاں لے گئے تو اس کا عاشق دھیدو (رانجھا) جوگیوں کی سی شکل بنا کر اور انہی کا سا بھیس بدل کر ہیر سے ملنے کے لیے رنگ پور کھیڑیاں پہنچا۔ گاؤں کے باہر ڈیرا لگایا اور دھونی رمائی۔ پھر کشکول پکڑا جسے پنجابی میں ''ٹھوٹھا'' کہا جاتا ہے اور بھیک مانگنے کے لیے رنگ پور کھیڑیاں (گاؤں) میں داخل ہوا۔ مانگتے مانگتے ہیر کے سسرال کے دروازے پر جا صدا لگائی۔ اسے دراصل جانا بھی وہیں تھا۔ اندر ہیر کی نند سہتی بیٹھی تھی۔ وہ بڑی اکھڑ مزاج عورت تھی۔ اس نے صدا لگانے والے جوگی (رانجھے) کو سخت الفاظ میں ڈانٹا تو وارث شاہ کے بقول رانجھے نے کہا:

گھر وسدا اوکھ سوال کیتا، ایتھے ہورای گھسور مسور یے جی

(ہم نے تو آباد گھر دیکھ کر روٹی کے ایک ٹکڑے کا سوال کیا تھا، لیکن یہاں کچھ اور ہی قسم کے جھگڑے جھمیلے ہو رہے ہیں)۔

ہمارے ساتھ کبھی اس قسم کا معاملہ تو نہیں ہوا، اس لیے کہ نہ ہم رانجھا تھے اور نہ کبھی کسی سہتی سے واسطہ پڑا۔ اب تک کا تجربہ یہ ہے کہ جس دروازے پر دستک دی اور صدا لگائی، کوئی نہ کوئی سخی ضرور مل گیا اور کشکول اگر بھرا نہیں تو اللہ کی مہربانی سے خالی بھی نہیں لوٹایا گیا۔ لیکن جب مانگنے کو پیشہ ہی بنا لیا جائے، اپنی کوئی چیز بھی نہ ہو اور مانگنے پر ہی گزارا ہو تو جواب میں انکار کا اندیشہ تو بہر حال رہتا ہے۔

یہاں یہ عرض کردوں کہ مولانا عارف جاوید محمدی یوں تو ایک مدت سے مولانا احمد الدین گکھڑوی کے سوانح حیات لکھنے کے لیے کہہ رہے تھے اور میں معذرت کر رہا تھا، لیکن جب انھوں نے زور دے کر فیصلہ کن انداز میں کہا تو بڑی پریشانی ہوئی، اس لیے کہ ان کے متعلق لکھنے کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہ تھا، صرف تین چار چھوٹے چھوٹے واقعات تھے جو قیامِ پاکستان سے بہت پیشتر سے ذہن کے کسی گوشے میں اٹکے ہوئے تھے۔ یہ واقعات زیادہ سے زیادہ بیس صفحات کے ہوں گے۔ میں نے یہ مجبوری انھیں بتائی، لیکن انھوں نے میری اس مجبوری کو قابل پذیرائی نہیں گردانا۔ اس کے بعد ان کے صاحب زادے حافظ عبدالرحمٰن کویت سے آئے۔ انھوں نے اپنے والدِ گرامی کا پیغام بھی دیا اور برخوردانہ لہجے میں اپنی طرف سے بھی کہا کہ یہ کام ضرور ہونا چاہیے۔

مولانا عارف جاوید محمدی سے تو میں شاید پھر بھی کسی نہ کسی طرح دامن چھڑا لیتا، لیکن اس بچے کو جواب دینا مشکل ہو گیا۔ بچہ مدینہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرتا ہے، یعنی ہم دیہاتیوں کی بولی میں ''مکے مدینے'' رہتا ہے۔ ہم ان دونوں مقدس ترین شہروں کا اسی طرح تلفظ کیا کرتے ہیں۔ کوئی مکے میں رہتا ہو یا مدینے میں، ہمارے نزدیک وہ بہ یک وقت دونوں شہروں میں مقیم ہے یعنی اس کا قیام ''مکہ مدینہ'' میں ہے۔ اب تو لوگوں کی معلومات کا سلسلہ بہت بدل گیا ہے، ورنہ کچھ عرصہ پہلے ہر عرب ملک کو ''مکہ مدینہ'' کہا جاتا تھا بلکہ یہ بھی تھا کہ جس شخص کو عربی بولتے ہوئے دیکھا، فوراً کہہ دیا یہ مکے مدینے رہتا ہے...... ''مکہ مدینہ'' میں قیام کے ساتھ ساتھ عبدالرحمٰن طالب علم بھی ہے اور حافظِ قرآن بھی۔! طالب علم اور حافظ قرآن کی شریعت میں بڑی فضیلت بیان فرمائی گئی ہے، اس لیے، اس کے سامنے حرف انکار مشکل ہو گیا، چنانچہ ہم نے ان باپ بیٹے کے فرمان پر کشکول پکڑا اور مولانا احمد الدین گکھڑوی کے حالات کا کھوج لگانے اور انھیں قلم بند کرنے کے لیے ہر اس دروازے پر پہنچے جہاں سے کچھ خیر خیرات ملنے کی توقع تھی۔

اس سلسلے میں پہلا کام یہ کیا کہ اخبار ''الاعتصام'' کے مینجر جناب محمد سلیم چنیوٹی کے نام سے اخباروں میں اعلان کرایا گیا کہ جو صاحبان مولانا احمد الدین گکھڑوی کے بارے میں کچھ معلومات رکھتے ہوں، وہ ان معلومات سے مطلع فرمائیں۔ جیسا کہ گزشتہ صفحات میں کسی جگہ بتایا گیا، میں نے بعض قابل احترام دوستوں کو ٹیلی فون بھی کیے اور بالمشافہ بھی بات کی۔ میرا خیال یہ تھا کہ سو صفحات بلکہ حشو وزوائد سے پاک اسّی صفحات کا مواد بھی مل جائے تو غنیمت ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا کہ دوستوں کے مخلصانہ تعاون سے اس مردِ درویش کے متعلق پونے تین سو صفحات سے بھی زیادہ صفحات کا مواد جمع ہو گیا، جسے مختلف ابواب میں تقسیم کر کے خوانندگانِ محترم کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

الحمد لله علیٰ ذالک۔

اسے مولانا احمد الدین مرحوم کی کرامت قرار دیجیے یا مولانا عارف جاوید محمدی کے اخلاص سے تعبیر کیجیے یا ہم گناہ گاروں کی کوشش کا نتیجہ کہیے، جو مرضی اس کا نام رکھیے، یہ اللہ تعالیٰ کا خاص کرم ہے کہ توقع سے بڑھ کر معلومات میسر آ گئیں۔

بہر کیف جو مجھ سے ہو سکتا تھا، اللہ کی مہربانی سے ہو گیا، بلکہ میرا یہ کہنے کو بھی جی چاہتا ہے کہ اللہ کے فضل سے اب مولانا احمد الدین سے متعلق معلومات میں کمی نہیں رہی، لیکن اگر کچھ کمی رہ بھی گئی ہے تو عین ممکن ہے آئندہ کوئی ایسے لائق اور محنتی اہل علم میدان تحریر میں آئیں جو قارئین کو مجھ سے بہتر اسلوب میں زیادہ معلومات فراہم کر دیں۔ نہ تحقیق کا دروازہ کبھی بند ہوا ہے اور نہ حصولِ معلومات میں کبھی رکاوٹ پیدا ہوئی ہے۔ علم سے دلچسپی رکھنے والے لوگ آگے بڑھتے اور تحقیق کی نئی سے نئی وادیوں کو طے کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔ ''فوق کل ذی علم علیم'' کے قرآنی الفاظ میں اسی حقیقت کا اظہار فرمایا گیا ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور ضروری بات یہ ہے کہ مولانا احمد الدین نے جن مسلمان اور غیر

مسلم مذہبی فرقوں کے اہل علم سے مناظرے کیے، ان کا الگ الگ ابواب میں ذکر کیا گیا ہے، مثلاً شیعہ، بریلوی، آریہ سماجی، عیسائی، مرزائی وغیرہ لیکن ان ابواب کے علاوہ ان کے مزید مناظروں کا ذکر ان دوستوں کے حوالے سے بھی آ گیا ہے جنھوں نے ان کے متعلق معلومات فراہم کیں۔ اللہ انھیں جزائے خیر سے نوازے۔ آمین

اس موقع پر لجنۃ القارۃ الہندیہ کے قابل احترام رئیس شیخ ابو خالد فلاح المطیری حفظہ اللہ کا ذکرِ خیر نہایت ضروری ہے۔ شیخ ممدوح کو موجودین اور مرحومین سلفی المسلک علماے کرام سے بے حد تعلقِ خاطر ہے۔ اس فقیر کی ملاقات ان سے لاہور میں بھی ہوئی اور کویت میں بھی۔ ان ملاقاتوں میں محترم المقام شیخ نے برصغیر کے متعدد سلفی علماے ذی شان کے بارے میں بعض باتیں دریافت فرمائیں اور انتہائی تکریم کے لہجے میں ان کا تذکرہ کیا۔ ان علما نے تصنیفی، تدریسی اور خطابتی انداز میں جو خدمات سرانجام دیں اور اپنے مسلک کی نشرواشاعت کے لیے جو تگ وتاز کی اس کی تفصیلات سے شیخ ابو خالد المطیری حفظہ اللہ خاص دلچسپی رکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کی زندگی کے ان پہلوؤں کو اجاگر کیا جائے۔

اب آخر میں دو باتیں اور عرض کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی عرض جماعتِ اہل حدیث کے لائق احترام اصحابِ قلم سے کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ان علماو زعما پر تو لکھتے ہیں، جن کے حالات آسانی سے میسر آ جاتے ہیں، کیوں کہ متعدد حضرات نے ان کی علمی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر کتابیں بھی تصنیف کی ہیں اور بے شمار مضامین بھی لکھے ہیں۔ بے شک اس کے باوجود بھی ان پر لکھنا چاہیے اور ضرور لکھیں۔ لیکن محنت کر کے انھیں ان علماے کرام کی خدمات کو بھی اجاگر کرنا چاہیے، جن پر یا تو لکھا ہی نہیں گیا یا بہت کم لکھا گیا ہے۔ ان حضرات نے دور دراز کے پیدل سفر کر کے مختلف دیہات میں جا کر وہاں کے لوگوں کی زبان میں ان کے فہم کے مطابق تقریریں کیں اور انھیں کتاب و سنت کے احکام و مسائل سمجھانے کی کوشش کی۔ ان کی مخلصانہ کوششوں سے دیہات میں

اسلام کی بے حد ترویج ہوئی اور بے شمار لوگ دین اسلام کی صراطِ مستقیم پر قدم زن ہوئے۔

دوسری گزارش جماعت اہل حدیث کے اربابِ اختیار کی خدمت میں پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔ وہ یہ کہ وہ اہل علم کے مالی اور معاشی حالات کا پتا کرتے رہیں۔ وعظ وتقریر یا کسی اور صورت میں وہ جماعت کی خدمت کرتے ہیں تو جماعت کے اصحاب اختیار کو بھی اس کا احساس کرنا چاہیے۔

انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان اہل علم کے نہ کارخانے چلتے ہیں، نہ ملیں، اور نہ یہ زمینوں اور مربعوں کے مالک ہیں۔ یاد رکھیے مسلمانوں کے اصل ''خادم اعلیٰ'' یہی لوگ ہیں جو انھیں احکام الٰہی کا درس دیتے اور برائیوں کے ارتکاب سے روکتے ہیں۔ ان کی معاشی حالت کا خیال رکھنا چاہیے۔

دعا ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو اعمال خیر کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

بندۂ عاجز

محمد اسحاق بھٹی

اسلامیہ کالونی، ساندہ لاہور۔

ٹیلی فون: 37143677

13۔ ستمبر 2010ء

3۔ شوال 1431ھ

☆☆☆

پہلا باب

متحدہ پنجاب کے بعض اضلاع کے چند علمائے کرام

تقسیم ملک سے قبل صوبہ پنجاب انتیس اضلاع پر مشتمل تھا اور ہر ضلعے میں ہر فقہی مسلک کے علمائے کرام موجود تھے۔ کسی ضلعے میں کم تعداد میں اور کسی میں زیادہ تعداد میں۔ یہ تمام علمائے کرام طویل مدت سے حالات کے مطابق دینی خدمات سرانجام دیتے آرہے تھے۔

پنجاب کے انتیس اضلاع میں سے جن اضلاع میں علمائے کرام بہت بڑی تعداد میں آباد تھے اور جن کی خدمات بہت نمایاں تھیں اور دائرۂ کار بہت وسیع تھا، ان میں فیروز پور، امرتسر، لاہور، گوجراں والا، سیالکوٹ اور ملتان کے اضلاع خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ تقسیم ملک کے نتیجے میں فیروز پور اور امرتسر کے ضلعے ہندوستان کے حصے میں آئے۔ ضلع لاہور کا بھی خاصا علاقہ ہندوستان کو ملا۔ ضلع فیروز پور کے صرف ایک چھوٹے سے گاؤں ''لکھوکے'' میں ایک ہی خاندان کے بہت سے جلیل المرتبت اصحابِ علم فروکش تھے، جن کی تصنیفی تگ وتاز کا سلسلہ بھی بہت وسیع تھا اور تدریسی مساعی کا حلقہ بھی نہایت وسعت پذیر تھا۔ پنجاب میں اہل حدیث کا پہلا دینی مدرسہ 1840ء کے پس وپیش اسی محدود آبادی کے گاؤں میں جاری ہوا تھا، جس نے ملک میں بے حد شہرت پائی اور بے شمار طلبا وعلماء نے اس میں تحصیل علم کی۔ اس کے جاری کرنے والے تھے حافظ بارک اللہ لکھوی اور ان کے فرزند ذی منزلت حافظ محمد لکھوی رحمۃ اللہ علیہم۔

پنجابی زبان میں قرآن مجید کی مفصل تفسیر جو سات ضخیم جلدوں پر محیط ہے، اسی گاؤں کے رفیع القدر عالم حافظ محمد لکھوی نے ''تفسیر محمدی'' کے نام سے لکھی جو کئی مرتبہ چھپی اور بہت مقبول ہوئی۔ یہ اولین مفسر تھے جنھوں نے پنجابی نظم میں قرآن مجید کی تفسیر رقم فرمائی۔

انھوں نے متنِ قرآن کے دو ترجمے کیے۔ پہلا پنجابی میں دوسرا فارسی میں۔ اس اعتبار سے حافظ محمد لکھوی پنجاب کے پہلے اور اب تک آخری عالم ہیں جنھوں نے پنجابی کے علاوہ قرآن کا فارسی ترجمہ کیا اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے بعد ہندوستان کے دوسرے عالم ہیں جنھوں نے بہ زبان فارسی اتنی اہم تریں خدمت سرانجام دی۔

قرآنِ مجید کا سب سے پہلا اردو ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی نے کیا۔ پھر تھوڑے بہت الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ ان کے بڑے بھائی حضرت شاہ رفیع الدین دہلوی نے ترجمہ کیا۔ اردو زبان نے زیادہ ترقی کی تو سید احمد حسن دہلوی کا ترجمہ ظہور میں آیا۔ اسی طرح ڈپٹی نذیر احمد، نواب وحید الزمان خاں، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا ابوالکلام آزاد اور دیگر بے شمار اہل علم کے تراجم قرآن ہمارے سامنے آئے۔ یعنی تغیر الفاظ کے باعث لاتعداد ترجموں سے ہم مستفید ہوئے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے فارسی ترجمے میں حافظ محمد لکھوی نے بھی کچھ تغیر کیا اور ایک نیا فارسی ترجمہ وجود میں آ گیا، لیکن حافظ صاحب نے اسے اپنا ترجمہ نہیں قرار دیا، شاہ ولی اللہ صاحب کا ترجمہ قرار دیا جو انھوں نے فتح الرحمٰن کے نام سے کیا۔ چنانچہ تفسیر محمدی کی پہلی جلد کے پنجابی منظوم دیباچے میں فرماتے ہیں۔

پہلی سطر زبان جو فارس ہے فتح الرحمانوں
پروچ عبارت کجھ تغیر جہت آسان زبانوں

یہ ان کا انکسار ہے کہ الفاظِ ترجمہ کو "تغیر" سے تعبیر فرمایا، جب کہ ہر ترجمہ تغیر الفاظ ہی سے نئے قالب میں ڈھلتا ہے۔

میں نے مختلف مقامات سے شاہ صاحب اور حافظ صاحب کے ترجموں کا تقابل کیا ہے، حافظ صاحب کا ترجمہ جسے وہ "کجھ تغیر" قرار دیتے ہیں، الفاظِ قرآن کے زیادہ قریب ہے۔۔۔ بہر حال یہ الگ موضوع ہے، جس پر قدرے تفصیل سے ان شاء اللہ اپنی زیر تصنیف کتاب "چمنستان حدیث" کے اس مضمون میں عرض کیا جائے گا جو حضرت حافظ محمد

لکھوی سے متعلق لکھنا چاہتا ہوں۔ یہاں ضلع فیروز پور کے قدیم اصحابِ علم کے ضمن میں چند الفاظ نوکِ قلم پر آ گئے ہیں۔

حافظ محمد لکھوی کی پنجاب میں بہت سی تحریری اولیات ہیں۔ وہ اس صوبے کے اولیں عالم ہیں، جنھوں نے عربی میں حدیث کی مشہور کتاب ابوداؤد کے حواشی تحریر کیے۔ یہ حواشی انھوں نے 1271ھ میں لکھے اور 1272ھ (1856ء) میں مطبع قادری دہلی سے شائع ہوئے۔ اس کے بعد کان پور میں چھپے۔

حضرت مولانا شمس الحق ڈیانوی نے ابوداؤد کی شرح عون المعبود لکھنا شروع کی تو جو کتابیں اس وقت ان کے پیش نگاہ تھیں، ان میں حافظ محمد لکھوی کے رقم فرمودہ یہ حواشی بھی تھے۔ چنانچہ مولانا ڈیانوی فرماتے ہیں:

النسخة الدهلوية المطبوعة في سنة 1272ه باهتمام الفاضل العالم محمد بن بارك الله الفنجابي. (1)

(1) عون المعبود جلد رابع صفحہ 553۔

انھی حضرت حافظ محمد لکھوی نے 1272ھ میں مشکوٰۃ شریف کے حواشی بہ زبان عربی تحریر فرمائے۔ اس کے آخر میں حافظ صاحب رقم فرماتے ہیں:

تم تحرير حواشي هذا الكتاب يوم الخميس السادس والعشرين من ذي الحجة سنة 1272ه بيدا ضعف عباد الله محمد بن مخدومي بارك الله.

یعنی ان حواشی کی تحریر کا سلسلہ جمعرات کے روز 26 ذی الحجہ 1272ھ کو اللہ کے کم زور تریں بندے محمد بن مخدومی بارک اللہ کے ہاتھ سے اختتام کو پہنچا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حافظ محمد لکھوی کے لکھنے کی رفتار بھی تیز تھی کہ صرف دو سال (1271ھ اور 1272ھ) میں ابوداؤد اور مشکوٰۃ کے حواشی مکمل کر دیے اور ان کی تصنیفات کو اہلِ علم میں اتنی مقبولیت حاصل تھی کہ فوراً چھپ بھی گئیں۔

میں عرض یہ کرنا چاہتا ہوں کہ صوبہ پنجاب کے بعض اضلاع میں بہت سے علماے

میں موجود تھے اور ان کی خدماتِ دینی کے دائرے دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں ایک ضلع فیروز پور تھا، جس کی اس وقت پانچ تحصیلیں تھیں۔ (1) تحصیل فیروز پور (2) تحصیل فاضلکا (3) تحصیل زیرہ (4) تحصیل مکتسر اور (5) تحصیل موگا۔ ان پانچوں تحصیلوں کے مختلف مقامات میں علمائے کرام بہت بڑی تعداد میں سکونت پذیر تھے۔

قیام پاکستان کے زمانے میں پنجاب کی جو کتر بیونت ہوئی، اس کے نتیجے میں ضلع امرتسر بھی ہندوستان کے حوالے کر دیا گیا۔ امرتسر شہر کے پہلے اہل حدیث عالم مولانا غلام العلی قصوری تھے، جنھوں نے اپنا قصور شہر کا ملکیتی مکان فروخت کر کے امرتسر میں زمین خریدی اور اس میں مسجد تعمیر کرائی۔ مسجد میں مدرسہ بھی جاری فرمایا، جس میں مولانا ثناء اللہ امرتسری نے تحصیل علم کا آغاز کیا۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری پنجاب کے اولیں عالم ہیں جنھوں نے اردو زبان میں ''تفسیر ثنائی'' کے نام سے پورے قرآن مجید کی تفسیر لکھی۔ عربی میں مکمل قرآن کی تفسیر لکھنے والے بھی وہ پہلے پنجابی عالم ہیں۔ ''اہل حدیث'' نام سے پہلا اخبار انھی نے جاری فرمایا۔ ان کی دینی اور علمی خدمات کا سلسلہ بے حد وسیع بلکہ ہمہ گیر ہے۔

امرتسر ہی میں علمائے غزنویہ نے تصنیفی اور تدریسی شکل میں دین کی تبلیغ کو اپنا مقصدِ حیات قرار دیا۔ ان سے فیض یاب ہونے والوں کو گنتی شمار میں لانا ممکن نہیں۔ روپڑی اصحابِ علم بھی اسی شہر میں دین کی خدمت میں مشغول ہوئے۔

شہر امرتسر کے علاوہ ضلع امرتسر کے بھی متعدد دیہات وقصبات میں بہت سے علمائے عظام نے جنم لیا اور اپنی بساط کے مطابق قرآن وحدیث کی نشر واشاعت کے لیے بہ درجہ غایت جدوجہد کی۔ مثلاً بھوجیاں، کمیر پور، ویرووال، بھینی سندھواں اور دیگر کئی مقامات میں کتنے ہی علما پیدا ہوئے، جنھوں نے اپنے آپ کو ہمیشہ خدمتِ دین کے لیے وقف کیے رکھا۔ پھر اسی راہ میں وفات پا گئے۔ اس شہر اور ضلعے کے متعدد علما نے اگست 1947ء میں

سکھوں کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا۔

تقسیم ملک سے پہلے پنجاب کے ان دو اضلاع (فیروز پور اور امرتسر) کے علاوہ جو اضلاع اہل علم کے مراکز تھے، وہ تھے لاہور، ملتان، سیالکوٹ اور گوجراں والا۔ یہ چار اضلاع پاکستان میں شامل ہوئے۔

آج سے ایک سو پندرہ بیس سال قبل لاہور شہر میں اہل حدیث کی تعداد بہت کم تھی۔ ان کی مسجدیں بھی صرف دو تھیں۔ چینیاں والی مسجد اور لسوڑے والی مسجد۔ ابتدائی دور میں خاص طور سے یہاں جن حضرات نے اس مسلک کی ترویج و اشاعت کے لیے کمرِ ہمت باندھی اور جن کی سعیِ مسلسل سے لاہور شہر اور ضلع لاہور میں کتاب و سنت کی نشوونما ہوئی، وہ تھے غزنوی علمائے کرام اور مولانا محمد حسین بٹالوی اور مولانا رحیم بخش (مصنف اسلام کی کتاب پہلا حصہ تا چودھواں حصہ) ان کے علاوہ اس وقت کے ضلع لاہور کی تحصیل چونیاں میں بالخصوص لکھوی علماء نے بے حد خدمات سرانجام دیں اور اس نواح کے لوگ ان سے بہت متاثر ہوئے۔ اس تاثر کے آثار اب بھی اس علاقے میں نمایاں نظر آتے ہیں۔

اس دینی تاثر نے سیاسی تاثر کی شکل بھی اختیار کی، چنانچہ 1951ء کے انتخابات میں یہاں سے مولانا سید محمد داؤد غزنوی اور مولانا محی الدین لکھوی پنجاب اسمبلی کے رکن منتخب کیے گئے۔ اس کے بعد ایک سے زیادہ مرتبہ انہی حلقوں سے قومی اسمبلی کے لیے مولانا معین الدین لکھوی کا انتخاب عمل میں آیا۔

ملتان میں بھی کم و بیش دو سو سال قبل علمائے حدیث کا ورود ہوا۔ ابتدا میں انھیں بڑی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ پھر آہستہ آہستہ حالات کا رخ بدل گیا اور تقسیم ملک تک اس شہر اور ضلع کے مختلف مقامات میں عاملینِ کتاب و سنت کی تعداد میں اللہ کے فضل سے بہت اضافہ ہو گیا تھا۔

سیالکوٹ شہر اور ضلع میں تقسیم ملک سے بہت پیشتر سے قرآن و حدیث کے متبعین

ومبلغین کا ایک مضبوط گروہ موجود تھا۔اس علاقے میں علمائے حدیث کی صدائے حق بھی توانا تھی اور لوگ ان کی تدریسی اور تصنیفی کوششوں کے معترف بھی تھے اور ان سے بہ درجۂ غایت متاثر بھی تھے۔مولانا غلام حسن سیالکوٹی،مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی اور بعض دیگر بزرگانِ گرامی کے مواعظِ حسنہ کا ان اطراف کے باشندوں پر بڑا اثر تھا جو اب تک قائم ہے اور لوگ ان کی مساعی کا بڑی مسرت سے تذکرہ کرتے ہیں۔وہ لوگ تاریخِ عاملینِ حدیث کا ایک نہایت مؤثر حصہ تھے۔

علم وعمل کے اعتبار سے بے شک شہر اور ضلع سیالکوٹ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی اسی شہر کے باشندے تھے،جنھوں نے اپنی خدمات دینی کے لحاظ پورے برصغیر میں شہرت پائی۔وہ بہت بڑے مصنف اور بہت بڑے مفسر تھے۔اسّی (80) سے زاید کتابیں ان کی تصانیف میں شامل ہیں اور یہ بے حد تحقیقی کتابیں ہیں۔یہ فقیر پہلا شخص ہے،جسے ان کے حالاتِ زندگی لکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

(ملاحظہ ہو قافلہ حدیث صفحہ 78 تا 123)

اسی علاقے سے حضرت مولانا محمد ابوالحسن کا تعلق تھا۔ان کی تصنیف فیض الباری شرح اردو صحیح بخاری دس ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے جو ہزاروں صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔صحیح بخاری کی اس اردو شرح میں فاضل مصنف نے فتح الباری،عمدۃ القاری،ارشاد الساری، کواکب الدراری،تیسیر القاری،منح الباری اور حاشیہ سندھی کا انتخاب جمع فرمادیا ہے اور اپنے موضوع کی یہ نہایت اہم کتاب قرار پا گئی ہے۔مولانا محمد ابوالحسن سیالکوٹی کو حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔

مولانا ہدایت اللہ نوشہروی بھی ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں ''نوشہرہ ککے زیاں'' کے رہنے والے تھے۔انھوں نے حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی اور حضرت سید عبداللہ غزنوی سے حصولِ فیض کیا۔اس عالم دین نے قرآن مجید کا پنجابی زبان میں ترجمہ کیا۔

شہید ملت علامہ احسان الٰہی ظہیر کا مولد بھی یہی شہر تھا۔ اس مردِ مجاہد نے اپنی بلند آہنگ خطابت اور عربی و اردو تصانیف کی بنا پر پوری اسلامی دنیا میں شہرت پائی۔

مولانا محمد علی جانباز مرحوم و مغفور نے بھی اسی شہر میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہاں انھوں نے جامعہ رحمانیہ کے نام سے دار العلوم جاری کیا جو اب بھی کامیابی سے جاری ہے۔ ان کا بہت بڑا تصنیفی کارنامہ سنن ابن ماجہ کی شرح انجاز الحاجہ ہے جو عربی زبان میں کئی ہزار صفحات کی بارہ جلدوں پر محیط ہے۔ اردو میں بھی انھوں نے متعدد کتابیں لکھیں۔

حکیم محمد صادق کا مولد و مسکن بھی سیالکوٹ تھا۔ حکیم صاحب مرحوم بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔

ان حضرات کے علاوہ بھی اس ضلع اور شہر میں کتنے ہی علمائے کرام پیدا ہوئے، جن کی خدماتِ دینی کا دائرہ بہت وسیع ہے۔



دوسرا باب

گوجراں والا کے چند علماے کرام

اب آیے گوجراں والا کی طرف۔ گوجراں والا علم وعمل کے اعتبار سے ہمیشہ پُرثروت علاقہ رہا۔ اس شہر اور ضلع کے بے شمار علماء وصلحاء میں سے بعض وہ ہیں جو دیگر علاقوں سے تشریف لائے اور پھر یہیں کے ہو رہے اور بعض وہ ہیں جو اسی علاقے میں پیدا ہوئے۔ ان سب حضرات نے اپنے اپنے مطالعہ وفکر کی روشنی میں بہ درجہ غایت علمی خدمات سرانجام دیں اور لاتعداد لوگوں نے ان سے فیض حاصل کیا۔ ان رفیع المنزلت حضرات میں سے چند بزرگانِ عالی قدر کے اسماے گرامی آئندہ سطور میں درج کیے جاتے ہیں۔

1۔ مولانا غلام رسول (ساکن قلعہ میہاں سنگھ)

عالم وفاضل اور نہایت متقی بزرگ تھے۔ ان کی کرامتوں کے ظہور اور قبولیتِ دعا کے حیرت انگیز واقعات لوگوں میں مشہور اور کتابوں میں مرقوم ہیں۔ ان کی تذکیر وتبلیغ اور ان کے مواعظِ حسنہ سے غیر مسلموں کی کثیر تعداد نے اسلام قبول کیا اور ان گنت مسلمانوں نے خلافِ شرع رسوم کو ترک کر کے صحیح اسلامی راہ اختیار کی۔ وہ حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے شاگرد اور حضرت سید عبداللہ غزنوی کے معاصر اور طلب حدیث میں ان کے ہم درس تھے۔ حضرت عبداللہ غزنوی سے انھوں نے روحانی فیض بھی پایا۔ مشہور بزرگ حضرت سید محمد امیر (کوٹھا والا) سے باقاعدہ بیعت تھے۔ اس سراپا زہد اور پیکرِ حسنات عالم دین نے 15۔ محرم 1291ھ (4۔ مارچ 1874ء) کو اپنے مسکن (قلعہ میہاں سنگھ) میں وفات پائی۔ اس فقیر نے ان کے حالات میں تذکرہ مولانا غلام رسول قلعوی کے نام سے کتاب لکھی ہے جو چار سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔

2۔ حافظ عبدالمنان

اسی ضلعے کے ایک جلیل القدر عالم حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی تھے، جنھوں نے مختلف علمائے عظام سے استفادے کے بعد دہلی جا کر حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی سے علم حدیث پڑھا اور سند لی۔ فارغ التحصیل ہوئے تو ضلع گوجراں والا کے شہر وزیر آباد میں مسندِ درس بچھائی اور محدثِ پنجاب کے پُر اعزاز لقب سے شہرت پائی۔

ہزاروں تشنگانِ علومِ قرآن وحدیث ان کے حلقۂ شاگردی میں داخل ہوئے، جن میں پنجاب کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے طالبانِ علم بھی شامل تھے بلکہ افغانستان اور عرب ممالک کے بھی متعدد طلبا نے ان کے حضور زانوئے تلمذ تہ کیے۔ صالحیت اور تقویٰ شعاری میں بھی وہ اپنا ایک مقام رکھتے تھے۔ ضلع گوجراں والا کے اس محدث جلیل نے 18۔ جولائی 1916ء (16۔ رمضان المبارک 1334ھ) کو وزیر آباد میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

3۔ مولانا عمر الدین

حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کے شاگردوں کی طویل فہرست میں ایک نام مولانا عمر الدین کا مرقوم ہے۔ یہ بزرگ جسمانی طور سے معذور تھے۔ جسم کا نیچے کا حصہ حرکت نہیں کرتا تھا اور چلنے پھرنے کی سکت نہ تھی۔ لیکن اوپر کا حصہ بالکل ٹھیک تھا۔ تمام علوم متداولہ میں مہارت رکھتے تھے۔ حضرت حافظ عبدالمنان صاحب کے زمانے میں بھی طلبا کو تعلیم دیتے تھے۔ بہت اچھے خطیب اور بہت اچھے مدرس تھے۔ تدریس اور مسجد کی خطابت کا کسی سے کوئی پیسا نہیں لیتے تھے۔ دن کو طالبانِ علم کو پڑھاتے اور رات کو چاندی اور سونے کے ورق بناتے تھے۔ یہی ان کی آمدنی کا ذریعہ تھا۔ ان سے طلبا کی کثیر تعداد نے استفادہ کیا۔ 9۔ جنوری 1941ء (9۔ ذی الحجہ 1359ھ) کو جمعۃ المبارک کے روز وزیر آباد میں وفات پائی اور اپنے استاذِ گرامی حضرت حافظ عبدالمنان کے پہلو میں دفن کیے گئے۔

ان کے بعد یکے بعد دیگرے جن حضراتِ علماء نے اس مسجد میں خطابت وامامت کا فریضہ انجام دیا، ان میں مولانا احمد الدین گکھڑوی کا نامِ نامی بھی شامل ہے۔ لیکن ان کا تذکرہ آگے تفصیل سے آئے گا۔

4۔ مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی

اسی شہر وزیر آباد کے ایک معروف عالم مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی تھے جو 27 رمضان المبارک 1299ھ (12۔اگست 1882ء) کو پیدا ہوئے۔ والد کا نام میراں بخش تھا اور وہ ریلوے کے محکمے میں ملازم تھے۔

فضل الٰہی کو ان کے والد نے وزیر آباد کے مشن ہائی سکول میں داخل کرایا۔ سکول کی تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ حافظ عبدالمنان صاحب سے مسجد میں دینیات کی تعلیم بھی حاصل کرتے رہے۔ 1900ء میں میٹرک پاس کر کے ریلوے میں بہ طور کلرک ملازمت کرنے لگے۔

حافظ عبدالمنان صاحب کے پاس مولانا اسماعیل شہید دہلوی کی جماعت مجاہدین کے لوگ بھی آتے تھے۔ مولانا فضل الٰہی کو وہیں دینیات کی تعلیم کے دوران اس جماعت کے متعلق کچھ معلومات حاصل ہوئیں اور اس میں وہ دلچسپی لینے لگے۔ پھر آہستہ آہستہ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ اسی جماعت سے وابستگی اختیار کر لی۔ سرکاری ملازمت ختم ہوگئی۔ جیل میں بھی رہے۔ آخر مرکزِ مجاہدین میں اسمست پہنچ گئے۔ ایک وقت آیا کہ امیر المجاہدین کی طرف سے ''امیر المجاہدین ہند'' مقرر کر دیے گئے۔ خفیہ طور سے ملک کے بے شمار سیاسی رہنماؤں سے ملے اور برصغیر کی آزادی کے لیے بے حد کوششیں کیں۔ اس سلسلے میں ان کا کاروانِ حیات بہت سی منزلوں سے گزرا۔ 5۔مئی 1951ء کو اپنے آبائی وطن وزیر آباد میں وفات پائی۔

5۔ صوفی عبداللہ

اس مردِ ذی شان کا تعلق بھی وزیر آباد سے تھا۔ اعوان برادری کے فرد تھے۔ والد کا نام

ملک قادر بخش تھا۔ ملک قادر بخش کے ایک بیٹے کا نام محمد سلطان تھا جو 1887ء کے پس و پیش پیدا ہوئے۔ محمد سلطان کچھ بڑے ہوئے تو ان کے مراسم مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی سے ہو گئے۔ ان مراسم کی وجہ سے ان کا تعلق بھی جماعت مجاہدین سے ہو گیا۔ پھر یہ بھی مرکزِ مجاہدین میں چلے گئے اور وہاں انھیں صوفی عبداللہ کے عرفی نام سے موسوم کیا گیا۔ اس جماعت سے وابستگی کی بنا پر انگریزی حکومت نے انھیں بہت سی تکلیفوں میں مبتلا کیا۔ 1922ء کے لگ بھگ یہ چک نمبر 493 گ ب اوڈاں والا (ضلع فیصل آباد) آ گئے۔ انگریزی حکومت کی خفیہ پولیس کے لوگ ان کے تعاقب میں رہتے تھے۔ پھر ایک وقت آیا کہ انھوں نے اوڈاں والا میں تعلیم الاسلام کے نام سے دینی مدرسہ قائم کر لیا۔ اس مدرسے نے دینیات کے تدریسی حلقوں میں بڑی شہرت پائی۔ صوفی صاحب نہایت نیک اور ولی اللہ بزرگ تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی دعائیں قبول فرماتا تھا۔ انھوں نے اوڈاں والا کے بعد ماموں کانجن میں بھی دارالعلوم قائم کیا، جس کا نام جامعہ تعلیم الاسلام رکھا گیا۔ اس دارالعلوم سے لاتعداد علما و طلبا نے تعلیم حاصل کی۔ صوفی صاحب کا حلقہ ارادت بہت وسیع تھا۔ انھوں نے 29۔ اپریل 1975ء کو وفات پائی۔ (1)

6۔ مولانا غلام نبی ربانی سوہدروی

وزیر آباد سے چند میل کے فاصلے پر ایک مشہور قصبہ سوہدرہ ہے۔ ضلع گوجراں والا کے اس قصبے میں متعدد اصحابِ علم پیدا ہوئے۔ ان میں ایک بزرگ مولانا غلام نبی ربانی صاحب تھے، جن کی تاریخ ولادت 23۔ رمضان المبارک 1263ھ (4۔ ستمبر 1848ء) ہے۔ انھوں نے مختلف علماء سے حصولِ علم کیا۔ لکھو کے جا کر حضرت حافظ محمد لکھوی سے کتبِ حدیث پڑھیں اور سند لی۔ پھر دہلی تشریف لے گئے۔ وہاں حضرت میاں

---

(1) ان کے حالات میں میں نے "صوفی محمد عبداللہ" کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی ہے جو ساڑھے چار سو صفحات پر مشتمل ہے اور مکتبہ سلفیہ شیش محل روڈ لاہور نے شائع کی ہے۔ اس کتاب کو اللہ تعالیٰ نے بڑی مقبولیت عطا فرمائی۔ کئی دفعہ چھپ چکی ہے۔

سید نذیر حسین سے استفادہ کیا اور سندِ حدیث کے مستحق قرار پائے۔ امرتسر میں حضرت سید عبداللہ غزنوی سے بھی مستفیض ہوئے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے وطن واپس آئے اور تصنیف وتدریس اور وعظ و خطابت کی صورت میں بڑی خدمات سرانجام دیں۔ مولانا ممدوح نے 4۔ذالحجہ 1348ھ (3۔مئی 1930ء) کو عیسوی حساب سے تقریباً بہ عمر 83 سال اور قمری حساب سے 85 سال کے لگ بھگ سوہدرہ میں وفات پائی۔

7۔ مولانا عبدالحکیم سوہدروی:

یہ مولانا غلام نبی کے لائق ترین فرزند تھے۔ 1873ء (1290ھ) کو پیدا ہوئے۔ درس نظامی کی تکمیل والد محترم سے کی۔ علم حدیث کی کتابیں حضرت حافظ عبدالمنان سے وزیرآباد میں پڑھیں۔ اپنے علاقے کے مشہور مبلغ اور واعظ تھے۔ عین عالم جوانی میں 1902ء (1320ھ) کو وفات پا گئے۔ جوان بیٹے کی میت باپ نے اپنے ہاتھوں قبر میں اتاری۔

8۔ مولانا عبدالحمید سوہدروی

یہ بھی مولانا غلام نبی کے لائق ترین فرزند تھے۔ سال ولادت 1882ء (1300ھ) ہے۔ ابتدائی درسی کتابیں والدِ عالی قدر سے پڑھیں۔ پھر حضرت حافظ عبدالمنان وزیرآبادی کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے۔ صحاح ستہ سمیت تمام مروجہ علوم کی تحصیل انہی سے کی اور سند لی۔ حضرت میاں سید نذیر حسین کے آستانۂ علم پر بھی پہنچے، ان سے اخذِ فیض کیا اور سند سے مفتخر ہوئے۔ حضرت میاں صاحب کے جلیل المرتبت شاگرد مولانا شمس الحق محدث ڈیانوی سے بھی استفادہ کیا۔ بعدازاں بھوپال کو روانہ ہوئے جسے اس زمانے میں علم وفضل کے مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ وہاں شیخ حسین بن محسن انصاری کا حلقۂ درس قائم تھا۔ ان سے فیض یاب ہوئے اور سند لی۔ واپس سوہدرہ تشریف لائے تو

اپنے نام سے مدرسہ حمیدیہ جاری کیا اور فریضۂ تدریس انجام دینے لگے۔ حضرت حافظ عبدالمنان وزیرآبادی نے ان کی قابلیت اور علمی سرگرمیوں سے متاثر ہوکر اپنی بیٹی ان کے عقد میں دے دی۔ مولانا عبدالحمید سوہدروی نے صرف تیس سال عمر پائی۔ 24۔ مئی 1912ء (7۔ جمادی الاخری 1330ھ) کو انتقال کر گئے۔ مولانا غلام نبی نے اپنے اس دوسرے جوان بیٹے کی نمازِ جنازہ بھی خود پڑھائی اور خود ہی تجہیز و تکفین کی۔ بیٹے کی وفات کے بعد وہ ان کے قائم کردہ مدرسہ حمیدیہ میں خدمت تدریس انجام دینے لگے۔ اس سے اٹھارہ سال بعد وہ خود بھی سفرِ آخرت پر روانہ ہوگئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

9۔ مولانا عبدالمجید خادم سوہدروی

سوہدرہ کے یہ عالم دین تصنیف و تالیف اور تقریر و خطابت کی وجہ سے پورے برصغیر میں مشہور ہوئے۔ یہ مولانا غلام نبی ربانی کے پوتے، مولانا عبدالحمید سوہدروی کے بیٹے اور حضرت حافظ عبدالمنان وزیرآبادی کے نواسے تھے۔ جنوری 1901ء (رمضان 1318ھ) کو پیدا ہوئے۔ گیارہ سال کی عمر میں سایۂ پدری سے محروم ہوگئے تھے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت اپنے جدِ امجد مولانا غلام نبی کی آغوشِ شفقت میں پائی۔ پھر سیالکوٹ میں مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کے دامنِ فضیلت سے وابستہ ہوئے۔ دینیات کی تعلیم کے علاوہ علم طب پڑھا اور تکمیل تعلیم کے بعد تحریر و نگارش سے رابطہ قائم کیا اور تقریر و خطابت میں بڑا نام پایا۔ سوہدرہ میں درس و تدریس کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ دینی صحافت کے میدان میں ہمیشہ سرگرم عمل رہے۔ ان کی وجہ سے قصبہ سوہدرہ کا نام متحدہ ہندوستان کے مذہبی اور دینی حلقوں میں پہنچا۔ مولانا عبدالمجید سوہدروی نے 6۔ نومبر 1959ء (5۔ جمادی الاولی 1379ھ) کو لاہور میں وفات پائی اور ان کی میت لاہور سے ان کے وطن سوہدرے لے جائی گئی اور وہیں دفن کیے گئے۔

اس خاندان کا سلسلۂ فیض ماشاءاللہ اب بھی جاری ہے اور اس کے معزز ارکان تحریری اور خطابتی شکل میں حالات کے مطابق خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

10۔ حضرت حافظ محمد گوندلوی

ضلع گوجراں والا ہی کے ایک بلند پایہ عالم حضرت حافظ محمد گوندلوی ہیں، وہ محدثِ دوراں اور بہت بڑے فاضل تھے۔ 1897ء (1315ھ) میں گوجراں والا کے ایک نواحی قصبے گوندلاں والا میں پیدا ہوئے۔ حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کے علاوہ امرتسر کے غزنوی علمائے کرام (مولانا عبدالاول غزنوی اور حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی) سے بھی فیض حاصل کیا۔ دہلی کے بعض علمائے ذی منزلت سے بھی مستفید ہوئے۔ تحصیل علم کے بعد جو تدریسی خدمات سرانجام دیں، ان کا احاطہ کرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ تدریس کے علاوہ ان کی تصنیفی مساعی کا دائرہ بھی بڑا پھیلا ہوا ہے۔ یہاں اس کی تفصیل میں جانا مقصود نہیں۔ صرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔ ان کے شاگردوں اور پھر آگے ان کے شاگردوں کے شاگردوں کا جو سلسلہ چلتا ہے، اسے ریاضیاتی گنتی میں لانا حد امکان سے باہر ہے۔ تقویٰ وتدین میں بھی وہ عالی مرتبے پر فائز تھے۔ حضرت حافظ صاحب نے 4۔ جون 1985ء (14۔ رمضان المبارک 1405ھ) کو وفات پائی۔

11۔ مولانا محمد اسماعیل سلفی

اسی علاقے سے تعلق رکھنے والے ارباب علم کی لائق اکرام جماعت میں حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کا اسم گرامی شامل ہے جو ہمارے ملک کے رفیع المنزلت عالمِ دین تھے۔ تحریر وتقریر اور درس وتدریس میں یکساں عبور رکھتے تھے۔ مولانا ممدوح 1897ء (1314ھ) کے پس وپیش ضلع گوجراں والا کی تحصیل وزیر آباد کے ایک گاؤں ڈھونیکے میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی مولانا محمد ابراہیم تھا جو اپنے عہد کے ممتاز خطاط تھے۔ حضرت مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری کی تصنیف تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی کی کتابت انہی مولانا محمد ابراہیم نے کی تھی۔ بے حد صالح اور صاحبِ تقویٰ بزرگ تھے۔ اپنے فرزندِ دلبند مولانا محمد اسماعیل کو ابتدائی تعلیم خود انہی نے دی۔ کچھ بڑے ہوئے تو وزیر آباد میں حضرت

حافظ عبدالمنان صاحب کی خدمت میں بھیج دیے گئے۔ کچھ عرصہ ان سے استفادہ کرتے رہے۔ بعد ازاں مختلف علمائے کرام سے کسب علم کیا۔ فراغت کے بعد 1921ء میں گوجرانوالا تشریف لائے اور پھر خطابت وتدریس کے سلسلے میں بے پناہ خدمات سرانجام دیں۔ ان کے فیض یافتگان کا حلقہ بے حد وسیع ہے۔ 20۔فروری 1968ء (20۔ذیقعدہ 1387ھ) کو ان کا انتقال ہوا۔

12۔ قاضی عبدالرحیم

ضلع گوجراں والا کا ایک قصبہ قاضی کوٹ کے نام سے موسوم ہے۔ علمی اعتبار سے بھی یہ قصبہ خاص شہرت رکھتا ہے اور سیاسی اعتبار سے بھی۔! اس قصبے کے ''قاضی خاندان'' کے ایک اہم رکن قاضی عبدالرحیم تھے۔ وہ 17۔دسمبر 1884ء (28۔صفر 1302ھ) کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر میں حاصل کی۔ 1895ء (1312ھ) میں حضرت حافظ عبدالمنان وزیرآبادی کے حلقۂ درس میں شریک ہوئے اور سات سال ان سے تعلیم حاصل کرتے رہے۔ سندِ فراغت لینے کے بعد 1905ء میں مولانا سید عبدالجبار غزنوی کی خدمت میں حاضری دی۔ ان سے دوبارہ صحیح بخاری پڑھی اور مولانا عبدالاول غزنوی سے ابوداؤد کا درس لیا۔ امرتسر کے اسی مدرسہ غزنویہ میں مولانا محمد معصوم ہزاروی سے استفادہ کیا۔ 1906ء سے 1908ء تک دہلی کے مدرسہ طبیہ میں علم طب پڑھا۔ حصولِ تعلیم کے بعد وطن آئے اور گوجراں والا میں مطب شروع کیا۔ ملک کی آزادی کے لیے بھی جدوجہد کی اور بعض سیاسی تحریکوں میں حصہ لیا۔ کچھ عرصہ گوجراں والا کے مدرسہ محمدیہ میں ان کا درس وتدریس کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ نہایت متقی بزرگ تھے۔ 27۔فروری 1971ء (2۔محرم 1391ھ) کو فوت ہوئے۔

13۔ مولانا محمد حنیف ندوی

ان کے آباواجداد کا مسکن شہر گوجراں والا تھا۔ 10۔مئی 1908ء کو گوجراں والا میں

پیدا ہوئے۔ 1921ء میں مولانا محمد اسماعیل سلفی گوجراں والا تشریف لائے تو ان کے حلقۂ درس میں شمولیت کی۔ بے حد ذہین تھے۔ اس زمانے کے تمام علوم درسیہ مولانا محمد اسماعیل سلفی سے پڑھے۔ 1925ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ لیا۔ پانچ سال وہاں رہے اور دارالعلوم کا نصاب مکمل کیا۔ قرآن مجید سے خاص طور پر شغف تھا۔ ندوہ میں قرآن کے موضوع پر تقریباً تین سال میں تخصص کی منزل طے کی۔ متعدد علمی کتابیں تصنیف کیں۔ قرآن مجید کے مطالب پر عبور حاصل تھا۔ گوجراں والا کے اس جلیل القدر عالم ومصنف نے 12۔ جولائی 1987ء (11۔ ذیقعدہ 1407ھ) کو لاہور میں وفات پائی۔

یہ ضلع اور شہر گوجراں والا کے چند اہل حدیث علمائے کرام ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بے شمار اصحابِ علم نے اس علاقے میں جنم لیا اور بے حد خدمات سرانجام دیں۔ اب احناف کے دیوبندی حضرات کی طرف آیئے۔

14۔ مولانا عبدالعزیز

موضع سہال (ضلع اٹک) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اسی نواح کے بعض اساتذہ سے حاصل کی۔ 1909ء (1327ھ) میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور شیخ الہند مولانا محمود حسن اور دیگر اساتذہ سے اکتسابِ علم کیا۔ فارغ التحصیل ہوئے تو گوجراں والا کے مسلم ہائی سکول میں ملازمت کرنے لگے۔ پھر وہاں کی جامع مسجد شیراں والا باغ کے خطیب بنا دیے گئے۔ اس مسجد میں مدرسہ انوار العلوم کا اجرا ہوا تو مولانا عبدالعزیز کو اس کے صدر مدرس بنایا گیا۔ ان سے بہت سے علما وطلبا نے تحصیل علم کی۔ تصنیف وتالیف سے بھی دلچسپی تھی۔ ملکی سیاسیات میں بھی حصہ لیا اور گرفتار ہوئے۔ اکتوبر 1940ء (رمضان 1359ھ) میں وفات پائی۔ اپنے آبائی وطن موضع سہال (ضلع اٹک) میں دفن کیے گئے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بھتیجے مولانا عبدالواحد صاحب کو ان کے جانشین مقرر کیا گیا۔

15۔ قاضی شمس الدین

1901ء میں موضع پڑی (تحصیل گھیپ ضلع اٹک) میں پیدا ہوئے۔ اپنے علاقے کے علمائے کرام سے تعلیم پائی۔ مولانا حسین علی (ساکن واں بھچراں) سے بھی مستفید ہوئے۔ حدیث کا دورہ دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ مولانا انور شاہ کشمیری اور مولانا شبیر احمد عثمانی سے کیا۔ مروجہ علوم سے فراغت کے بعد مختلف مقامات میں فریضہ درس سرانجام دیتے رہے۔ پھر گوجراں والا تشریف لائے۔ یہاں بعض مدارس میں تدریس کی۔ 1958ء میں دیوبندی علماء کے درمیان مسئلہ حیات النبی (ﷺ) پر اختلاف نے شدت اختیار کی اور یہ حضرات دو گروہوں میں بٹ گئے تو قاضی صاحب موصوف نے جامعہ صدیقیہ کے نام سے ایک نئے مدرسے کی بنیاد رکھی۔ ان سے بہت لوگوں نے کسب فیض کیا۔ تدریس کے علاوہ تصنیفی خدمات بھی سرانجام دیں۔ 21۔ مئی 1985ء (11۔ رمضان 1405ھ) کو گوجراں والا میں رحلت فرمائی۔

16۔ قاضی نور محمد

یہ عالم دین قاضی شمس الدین کے (جن کا ابھی تذکرہ ہوا) بڑے بھائی تھے۔ 1896ء (1314ھ) کو موضع پڑی (تحصیل گھیپ ضلع اٹک) میں پیدا ہوئے۔ اعوان برادری سے تعلق تھا۔ درس نظامی کی تمام کتابیں ایک بزرگ مولانا غلام رسول معروف بہ بابا جی سے پڑھیں۔ پھر مولانا حسین علی (واں بھچراں) سے حدیث اور ترجمہ وتفسیر قرآن کی تکمیل کی۔ دورۂ حدیث مولانا انور شاہ کشمیری سے جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں پڑھا۔ عملی زندگی کا آغاز تدریس سے کیا۔ ضلع گوجراں والا کے قصبہ قلعہ دیدار سنگھ میں سکونت اختیار کی۔ تصنیف و تالیف اور وعظ وتبلیغ سے بھی تعلق تھا۔

موت کا واقعہ بڑا عجیب ہے۔ 1958ء میں دیوبندی علما میں مسئلہ حیات النبی ﷺ سے متعلق شدید نزاع پیدا ہو گیا تھا اور وہ دو گروہوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک گروہ کا نقطۂ

نظریہ تھا کہ نبی ﷺ اپنی قبر مبارک میں اسی طرح زندہ ہیں، جس طرح دنیا میں زندہ تھے اور دنیا کی ہر چیز دیکھتے اور لوگوں کی باتیں سنتے ہیں۔ دوسرا گروہ اس سے اختلاف کرتا تھا۔ ان کا موقف یہ تھا کہ نبی ﷺ وفات پا گئے ہیں۔ آپ نہ کسی کو دیکھتے ہیں، نہ کسی کی بات سنتے ہیں۔ پہلے گروہ کو ''حیاتی'' دوسرے کو ''مماتی'' کہا جاتا ہے۔ یہ نزاع بہت شدت اختیار کر گیا تھا، جسے ختم کرانے اور دونوں دھڑوں میں صلح کرانے کے لیے 1962ء میں دیوبند سے قاری محمد طیب صاحب تشریف لائے۔ ان حضرات کا اجتماع راولپنڈی میں ہوا اور وہیں اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے قاضی نور محمد اچانک وفات پا گئے۔ پھر ان کی میت قلعہ دیدار سنگھ لائی گئی اور وہاں دفن کیے گئے۔ جنازہ سید عنایت اللہ شاہ بخاری (ساکن گجرات) نے پڑھایا۔

17۔ مولانا محمد سرفراز خاں صفدر

ان کا مقام ولادت موضع ڈھکی چڑاں ضلع (مانسہرہ) ہے اور سال ولادت ہے 1914ء۔۔۔! مختلف مقامات کے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ دارالعلوم دیوبند اور اکوڑہ خٹک میں بھی تحصیل علم کرتے رہے۔ فراغت کے بعد گوجراں والا میں تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ گکھڑ کی ایک مسجد میں طویل عرصے تک خطابت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔

کچھ عرصہ پیشتر مجھے ایک صاحبِ قلم عالم میاں محمد الیاس صاحب نے اپنی ایک کتاب ارسال فرمائی تھی، جس کا نام ہے ''مولانا حسین علی رحمۃ اللہ علیہ''۔ اس کتاب کے صفحہ 353 سے صفحہ 355 تک (تین صفحات میں) مولانا سرفراز خاں صفدر کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ فاضل مصنف نے مولانا ممدوح کی تصنیفی زندگی کو دو ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ ان کے نزدیک ''مولانا کی 1960ء سے پہلے کی تصانیف مولانا حسین علی صاحب (واں بھچراں) کی فکر کی بہترین ترجمان ہیں''۔ ان تصانیف میں ''مسئلۂ توحید اور اس کے متعلقات ان کے

مزاج اور قلم پر غالب رہے۔" نیز ردِ بدعات، علمِ غیب، مسئلہ مختار کل اور مسئلہ حاضر ناظر وغیرہ میں انھوں نے بریلوی حضرات کی مخالفت کی۔ لیکن

"واحسرتا۔ انھوں نے مسئلہ حیات النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں مختلف اندازِ فکر اختیار کیا اور انہی دلائل کی تصدیق میں باقی عمر لگادی، جن کی تردید و مذمت میں پہلی عمر گزری تھی، اور جن روایات کو اہل بدعت کے مقابلے میں قابلِ اعتماد نہ جانا، اہلِ توحید کے مقابل انہی روایات سے استدلال کیا۔ اس طرح 1960ء کے بعد کی تصانیف ایک اعتبار سے مجموعہ تضادات ٹھہریں۔"

آخر میں میاں محمد الیاس تحریر کرتے ہیں کہ

"خود مولانا مدظلہ بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں اور فرماتے ہیں۔"

"میں اچھا بھلا توحید کا کام کر رہا تھا، ان لوگوں کی شدت نے میرا رخ بدل دیا اور پھر چل سو چل۔"

مولانا سرفراز خاں صفدر کے ان الفاظ کا واضح مطلب یہ ہے کہ وہ مسئلہ توحید پر قائم نہ رہ سکے اور دوسروں کی ضد میں آکر اس بنیادی مسئلے کو ترک کر دیا اور پھر اسی ضد پر قائم رہتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ انھوں نے 4 اور 5۔ مئی 2009ء کی درمیانی شب کو وفات پائی۔

18۔ مولانا محمد چراغ

مولانا ممدوح کی ولادت 14۔ جمادی الاولیٰ 1314ھ (22۔ اکتوبر 1896ء) کو موضع دھکڑ (ضلع گجرات، پنجاب) میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم موضع گنجہ کے ایک عالم مولانا سلطان محمود سے حاصل کی، جو شیخ الہند مولانا محمود حسن کے شاگردوں میں سے تھے۔ پھر ضلع گجرات کے موضع انی کے ایک بزرگ مولانا ولی اللہ صاحب سے استفادہ کیا۔ مولانا محمد چراغ کے بڑے بھائی مولانا محمد سراج لاہور میں قیام پذیر تھے، مولانا ممدوح ان کے پاس

لاہور آ گئے۔ چار سال ان کے پاس رہے۔ اس اثنا میں مدرسہ نعمانیہ (اچھرہ) کے بعض اساتذہ سے تحصیل علم کی۔ لاہور میں خطاطی اور خوش نویسی بھی سیکھی۔ پھر سہارن پور چلے گئے، وہاں مدرسہ مظاہر علوم میں داخلہ لیا۔ دارالعلوم دیو بند جا کر مولانا اصغر حسین سے ابوداؤد کا درس لیا، مفتی عزیز الرحمٰن سے طحاوی پڑھی اور مولانا اعزاز علی سے عربی ادب کی کتابیں حماسہ، متنبّی اور مقامات حریری وغیرہ پڑھیں۔ مولانا انور شاہ صاحب کشمیری سے جامع ترمذی پڑھی اور ان کی تقریریں جو وہ ترمذی پڑھاتے وقت اردو میں کیا کرتے تھے، دورانِ درس عربی میں لکھیں اور وہ ''العرف الشذی'' کے نام سے چھپیں۔

دارالعلوم دیو بند سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد ایک سال میرٹھ کے ایک مدرسے میں تدریس کی۔ وہاں سے لاہور آ کر جامعہ فتحیہ (اچھرہ) میں کچھ عرصہ پڑھاتے رہے۔ علی پور سیداں (ضلع سیالکوٹ) میں سید جماعت علی شاہ صاحب کے فرزند سید محمد حسین کو بھی کچھ مدت تعلیم دی۔ بعد ازاں گوجراں والا تشریف لے گئے۔ وہاں 1924ء سے 1936ء تک (بارہ سال) مدرسہ انوار العلوم شیراں والا باغ میں درس وتدریس کی خدمت سرانجام دی۔ یکم جنوری 1936ء کو مسجد ارائیاں (بیرون کھیالی دروازہ گوجراں والا) میں جامعہ عربیہ کی بنیاد رکھی۔ 1967ء تک اس دارالعلوم میں بے شمار طلبا کو تعلیم دی۔ بعد ازاں جامعہ عربیہ کو جی ٹی روڈ پر کھلی جگہ میں منتقل کر دیا گیا۔

مولانا مرحوم وسیع القلب عالم تھے۔ مسلکی تعصب سے ان کا ذہن خالی تھا۔ ان کی قائم کردہ جامعہ عربیہ میں متعدد اہل حدیث طلبا نے داخلہ لیا اور مولانا سے مستفید ہوئے۔ حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی اور مولانا محمد حنیف ندوی سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ 1930ء کی تحریک آزادی میں نوجوان بھارت سبھا کی طرف سے مولانا محمد چراغ نے بھی حصہ لیا تھا اور مولانا محمد حنیف ندوی نے بھی۔ انگریزی حکومت نے دونوں کو گرفتار کر کے قصور کی جیل میں قید کر دیا تھا۔

مولانا محمد چراغ اس فقیر پر شفقت فرماتے تھے۔ جب بھی ان سے ملاقات ہوئی،

انھوں نے بے حد مشفقانہ لہجے میں خیر وعافیت پوچھی۔

اس عالم دین نے 14۔رمضان المبارک 1409ھ (21۔اپریل 1989ء) کو وفات پائی۔

19۔ مولانا محمد حسین

ضلع گوجراں والا کے قصبہ گونداں والا میں احناف کے بریلوی مکتبِ فکر کے حامل ایک عالم دین مولانا محمد حسین تھے جو مناظر بھی تھے اور مدرس وخطیب بھی تھے۔تقسیم ملک سے قبل ان کی بڑی شہرت تھی۔ان کی تاریخ ولادت ووفات کا علم نہیں ہوسکا۔ان کے علاوہ اس ضلعے میں بریلوی مسلک کے اور بھی علماء تھے۔اب بھی خاصی تعداد میں موجود ہیں۔

20۔ مفتی جعفر حسین

یہ گوجراں والا کے شیعہ عالم تھے جو 1913ء کو گوجراں والا کے ایک علمی خاندان میں پیدا ہوئے۔ابتدائی طور پر گوجراں والا میں قاضی عبدالرحیم اور مولانا محمد اسماعیل سلفی سے استفادہ کیا۔کچھ عرصہ مولانا محمد چراغ کے حلقۂ شاگردی میں رہے۔بعد ازاں لکھنؤ چلے گئے۔وہاں کے بعض شیعی مدارس میں شیعہ مدرسین سے تعلیم حاصل کی۔1936ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے نجف اشرف (عراق) گئے اور وہاں شیعہ اہل علم سے مستفید ہوئے۔فارغ التحصیل ہونے کے بعد واپس ہندوستان آئے اور یوپی کے شیعہ حضرات کے بعض مدارس میں فریضۂ تدریس انجام دیا۔قیامِ پاکستان کے بعد اپنے مسلک کی بڑی خدمت کی۔29۔اگست 1983ء کو فوت ہوئے۔کربلا گامے شاہ لاہور میں دفن کیے گئے۔

عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ گوجراں والا شہر اور ضلع ہمیشہ اہل علم کا مسکن رہا ہے۔ اس علاقے میں ہر فقہی مسلک کے علما کی تدریسی اور تصنیفی سرگرمیاں جاری رہیں اور لوگوں نے ان سے خوب استفادہ کیا۔انھی حضرات میں ایک عالم دین مولانا احمد الدین گکھڑوی تھے،جن کے حالات میں یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ان کا تذکرہ آئندہ صفحات میں کیا جارہا ہے۔

تیسرا باب

خاندانی پس منظر

مولانا احمد الدین گکھڑوی کے تذکرے سے پہلے چند سطریں گکھڑ اور مولانا کے خاندان کے بارے میں۔!

ضلع گوجرانوالا کا ایک مشہور مقام گکھڑ ہے جو گوجرانوالا سے 36 کلومیٹر کے فاصلے پر جی ٹی روڈ پر واقع ہے اور گکھڑ برادری کا آباد کردہ ہے۔ اس علاقے میں یہ دری کی صنعت کا معروف مرکز ہے۔ کسی زمانے میں یہ چھوٹا سا گاؤں تھا جو نہ علم کی روشنی سے زیادہ آشنا تھا اور نہ توحید وسنت کی نعمت سے بہرہ ور تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ حالات بدلتے گئے۔ پہلے اس گاؤں نے قصبے کی شکل اختیار کی اور پھر اچھا خاصا شہر ہو گیا، جس میں بہت سے اہل علم نے جنم لیا۔ ان اہل علم میں دینیات کے ماہرین کا بھی خاصا حلقہ شامل ہے۔

دینیات کے اہل علم کی اس جماعت میں جن حضرات کو اللہ تعالیٰ نے خاص شہرت سے نوازا، ان میں مولانا احمد الدین گکھڑوی کا اسم گرامی قابلِ ذکر ہے۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ دینیات کے علمی حلقوں میں ''گکھڑ'' کا ثقیل نام انھی کی وجہ سے متعارف ہوا اور لوگوں کی زبانوں پر چڑھا۔ مولانا احمد الدین ذاتی طور پر گرم مزاج اور ''ثقیل'' کلام تھے، لیکن انھوں نے اپنے ثقیل حروف کے مسکن کو اپنی ہمہ گیر علمی تگ وتاز سے نرمی کے قالب میں ڈھال دیا اور چھوٹے بڑے ہر شخص کی زبان سے یہ بوجھل لفظ آسانی سے ادا ہونے لگا۔ مولانا احمد الدین سے پہلے کے کسی ایسے مقامی عالم دین کا پتا نہیں چلتا، جسے گکھڑوی کی نسبت سے پکارا جاتا ہو اور اس نے اس نسبت کی وجہ سے اتنی شہرت حاصل کی ہو، جتنی مولانا احمد الدین

نے حاصل کی۔اس اعتبار سے مولانا احمد الدین اس نواح کے اولیں عالم دین ہیں جو گکھڑوی کہلائے اور نامور ہوئے۔

جس طرح مولانا عبدالمجید سوہدروی کی وجہ سے ''سوہدرہ'' نے شہرت پائی، اسی طرح مولانا احمدالدین گکھڑوی کی وجہ سے ''گکھڑ'' کا نام دینی علم کے حلقوں میں مشہور رہوا۔

خاندانی سلسلہ

مولانا احمدالدین گکھڑوی کا خاندانی پس منظر کیا ہے؟ ان کے آباواجداد کیا کرتے تھے اور سوسوا سوسال قبل کے معاشرے میں ان کی کیا حیثیت تھی؟ اس کا زیادہ سراغ نہیں ملتا۔صرف دو چیزوں کے دھندلے سے آثار نظر آتے ہیں اور یہ دھندلے سے آثار ہی دراصل ہمیں صحیح منزل تک پہنچانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔

ایک یہ کہ ان لوگوں کا پیشہ آہن گری تھا اور لوگ انھیں ''مستری'' کہا کرتے تھے۔ یہاں یہ یاد رہے کہ جس طرح دنیا کے حالات بدلتے ہیں، اسی طرح الفاظ کے معانی بھی بدلتے ہیں اور ان کے محلِ استعمال میں تبدیلی آتی ہے۔مثلاً لفظ ''مستری'' کا اطلاق کسی زمانے میں ان لوگوں پر ہوتا تھا، جن پر آج کل لفظ انجینئر کا اطلاق ہوتا ہے۔اسی طرح کوئی زمانہ تھا کہ ''ملا'' کے معنے بہت بڑے عالم کے تھے، لیکن اب کسی کو تحقیر کے لیے ملا کہا جاتا ہے۔''مولوی'' کا لفظ کسی کی فضیلت علمی کو ظاہر کرتا تھا، لیکن اب یہ کسی کی ''حقارت'' کا اظہار کرتا ہے۔

ایک دور تھا کہ مکانوں کی تعمیر کرنے والوں کو، آہن گروں کو اور لکڑی کا سامان یعنی الماریاں اور دروازے وغیرہ بنانے والوں کو مستری کہا جاتا تھا اور یہ لفظ ان کے لیے احترام کے پہلو کو اجاگر کرتا تھا اور مولانا احمدالدین گکھڑوی کے بزرگ اور بھائی وغیرہ آہن گر ہونے کی بنا پر مستری کے طور پر مشہور تھے اور تکریم کے مستحق گردانے جاتے تھے۔

دوسری بات جس کا پتا چلتا ہے، یہ ہے کہ مولانا احمدالدین کے والد جناب اللہ دتا

صاحب حاجی تھے۔ اس سے اس حقیقت کی نشان دہی ہوتی ہے کہ ان کی مالی حالت بہت اچھی تھی۔ آج سے ایک سو بیس پچیس برس پہلے حج بیت اللہ کا عزم کرنا اور اس کے لیے سامانِ سفر یا زادِ راہ مہیا کرنا بہت مشکل تھا۔ وہ بے حد سستا زمانہ تھا، لیکن پیسا انتہائی مہنگا تھا۔ بہت آسودہ حال لوگ ہی حج کر سکتے تھے۔ جن لوگوں کی مالی حالت کمزور تھی، ان کے لیے حج کا تصور کرنا بھی ممکن نہ تھا۔ پھر حاجی کو اس عہد کے معاشرے میں نہایت احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

مسلمانوں میں بھی اور غیر مسلمانوں میں بھی حاجی کو معزز ترین آدمی گردانا جاتا تھا اور لوگ اس کی بات مانتے تھے۔ اس لیے گزشتہ سوسوا سو سال پیشتر کے حالات کے تناظر میں ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہیں کہ مولانا احمد الدین گکھڑوی کے گھرانے کو اس عہد میں تکریم کا مقام حاصل تھا۔ معاشی اعتبار سے بھی اور معاشرتی اعتبار سے بھی وہ بہت اچھی حیثیت کے مالک تھے۔

آہن گری کا سلسلہ ان کے خاندان کا پیشہ اور ذریعہ آمدنی تھا۔ اسے ان کی قوم یا ذات قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بے شمار لوگ کئی قسم کے کاروبار کرتے ہیں۔ یہ کوئی بری بات نہیں ہے، بلکہ اپنے ہاتھ سے کما کر کھانا شرعی اور معاشرتی اعتبار سے نہایت قابل تحسین عمل ہے۔ صحت مند ہونے کے باوجود بے کار رہنا غلط ہے۔ کسی نہ کسی کام میں مصروفیت کو ہر دور اور ہر مقام میں قابل ستائش سمجھا جاتا ہے۔

آہن گری وہ کام ہے، جس کا خود قرآن نے ذکر کیا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام آہن گر تھے، اور اللہ کے برگزیدہ پیغمبر تھے۔ قرآن مجید میں ان کی اس صنعت کا خاص طور پر ذکر فرمایا گیا ہے اور ارشاد ہے:

والنا له الحديد (سورہ سبا:10)

"اور ہم نے ان کے لیے لوہا نرم کر دیا۔"

اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم دیا۔

ان اعمل سابغات وقدر فی السرد (سبا:11)

یعنی لوہے کی زرہیں اس انداز سے بناؤ کہ پہننے والے کے جسم پر پوری آئیں، اور ان کی کڑیاں بالکل درست ہوں، چھوٹی بڑی نہ ہوں، پہننے والے کو اس میں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔

لوہے کی زرہیں زمانۂ جنگ میں اور خطرے کے موقعے پر دشمن سے بچاؤ کے لیے پہنی جاتی تھیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا ایجاد کردہ یہ سلسلہ اب بھی چلتا ہے۔

قرآن کی رو سے کہنا چاہیے کہ مولانا احمد الدین گکھڑوی کے اسلاف، ان کے خاندان کے افراد اور خود ان کا پیشہ حالات کی رفتار کے مطابق پیغمبرانہ پیشہ تھا۔ اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ پیشے کے اعتبار سے ان کا خاندان حضرت داؤد علیہ السلام سے تعلق رکھتا ہے اور یہ لوگ انہی کی آل اولاد ہیں جو کسی زمانے میں برصغیر میں آبسے۔!

غرض جن لوگوں کو آج برصغیر کی بولی میں لوہار اور عربی زبان میں حداد کہا جاتا ہے، وہ معمولی حیثیت کے لوگ نہیں ہیں۔ ان کا مرتبہ ان کے کام اور پیشے کی حیثیت سے بہت بڑا ہے۔ یہ لوگ بے حد مشقت کے ساتھ وہ کام کرتے ہیں جو اور کوئی نہیں کر سکتا۔ لوگ اس کام کے لیے ان کے محتاج ہیں۔ اس پیشے سے مسلمان بھی بہت بڑی تعداد میں منسلک ہیں اور غیر مسلم بھی۔!

مولانا احمد الدین گکھڑوی کا تعلق اسی گروہ (یا برادری) سے تھا۔ وہ اپنے آپ کو حداد کہلانے میں فخر محسوس کرتے تھے اور بسا اوقات تقریروں اور مناظروں میں بلند آہنگی سے حریف کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ میرے ساتھ سیدھی بات کرو، میں لوہار ہوں اور ٹھیک ٹھیک ''پھاناں'' ٹھوکتا ہوں۔ ''پھاناں ٹھوکنا'' ان لوگوں کی ایک خاص اصطلاح ہے۔ چارپائی وغیرہ میں کوئی جھول ہو تو وہاں ایک لکڑی ٹھوکی جاتی ہے، جسے پھاناں کہتے

ہیں۔اس سے جھول ختم ہو جاتی ہے۔

انہی سے ملتے جلتے ایک گروہ کو ''ترکھان'' کہا جاتا ہے جو لکڑی کا کام کرتے ہیں۔ ہندوستان کے ایک سابق صدر گیانی ذیل سنگھ اسی برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ان کے والد کا نام کشن سنگھ تھا، جو لکڑی کا کام کرتے تھے۔ کچھ عرصہ باپ کے ساتھ ذیل سنگھ بھی یہ کام کرتے رہے۔ بعد میں انھوں نے امرتسر میں اپنا مذہبی علم پڑھا اور گیانی کہلائے۔ پھر سیاست کے میدان میں اترے اور ہندوستان کے منصب صدارت تک پہنچے۔یعنی پورے ہندوستان کی بڑی بڑی برادریوں کی سیاست میں پھاناں ٹھوک دیا۔

پاکستان میں بھی اس برادری کے بے شمار لوگ ہیں جنھوں نے علمی لحاظ سے بھی بڑی ترقی کی اور اللہ کے دین کے بھی بہت بڑے خادم ثابت ہوئے۔کاروباری اعتبار سے بھی بہت آگے بڑھے اور سیاسیات میں بھی بے حد خدمات سرانجام دیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ترکھانوں کا کام بھی پیغمبری پیشہ ہے۔حضرت نوح علیہ السلام کو خود اللہ تعالیٰ نے کشتی بنانے کا حکم دیا۔فرمایا:

واصنع الفلک باعیننا و وحینا۔(سورہ ہود:37)

(ہماری آنکھوں کے سامنے اور ہمارے حکم کے مطابق کشتی بناؤ۔)

ویصنع الفلک و کلمامر علیہ ملا من قومہ سخر وامنہ

(سورہ ہود:38)

یعنی اللہ کے حکم سے اس کے بتائے ہوئے طریقے کے ساتھ حضرت نوح علیہ السلام کشتی بنانے لگے اور جب ان کی قوم کا کوئی گروہ ان کے قریب سے گزرتا تو انھیں کشتی بناتے ہوئے دیکھ کر ان کا مذاق اڑاتا۔

ظاہر ہے کشتی لکڑی ہی کی بنائی جاتی ہے اور لکڑی کا سامان بنانے والوں کو ہماری بولی میں ترکھان کہا جاتا ہے اور حضرت نوح علیہ السلام نے ترکھانوں والا کام کیا تھا۔اس لیے موجودہ اصطلاح میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام جو اللہ کے پہلے پیغمبر تھے،

ترکھان تھے۔ یا یوں کہیے کہ ترکھان حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک مناظر نے مناظرے میں مولانا احمد الدین کو ترکھان کا طعنہ دیا تو انھوں نے فرمایا کہ حضرت نوح علیہ السلام بھی ترکھان تھے۔ حضرت ذکریا علیہ السلام بھی ترکھان تھے۔ غرض کوئی پیشہ اور کوئی کام بھی برا نہیں ہے، بشرطے کہ خلاف شرع نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ خلاف شرع کام کو ہرگز پسند نہیں فرماتا۔ وہ لوگوں کو حلال کمائی کا حکم دیتا ہے۔ برے کاموں سے سختی کے ساتھ روکتا ہے۔ اگر خیرات وحسنات کا سلسلہ جاری ہے تو ہر برادری اور ہر پیشہ (جو خلاف شرع نہ ہو) لائق احترام ہے۔ از راہ مزاح حجام (نائی) عام طور پر کہا کرتے ہیں کہ ہمارا ہاتھ چھوٹے بڑے ہر شخص کے سر پر ہے۔ کوئی شخص ہمارے پاس آتا اور حجامت بنواتا ہے تو اس کا سر ہمارے سامنے جھکا ہوتا ہے۔ یہ حقیقت بھی ہے۔

مشہور دیوبندی عالم حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی اسی برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ 1920ء کے دسمبر کی آخری تاریخوں میں حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری کی تجویز وتحریک سے امرتسر میں جب جمعیت علمائے ہند کا قیام عمل میں لایا گیا تو اس کے پہلے صدر انہی حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کو بنایا گیا تھا جو طویل عرصے تک اس منصب پر فائز رہے۔ اس طرح اس دور کے برصغیر کے ان تمام علمائے کرام کے سروں پر (جو جمعیت علمائے ہند سے تعلق رکھتے تھے) حضرت مفتی صاحب کا ہاتھ تھا۔ حضرت مفتی صاحب کے مدرسہ امینیہ کی جو دہلی میں جاری کیا گیا تھا، ملک میں بڑی شہرت تھی۔ اس مدرسے سے بے شمار لوگوں نے تعلیم حاصل کی۔

حضرت مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے اور دہلی میں جمعیت علمائے ہند کے دفتر میں ان کی زیارت کرنے کا شرف اس فقیر کو بھی حاصل ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ حضرت مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا احمد سعید دہلوی اور دیگر بڑے بڑے علمائے کرام واقعتاً ان کے سامنے مؤدب بیٹھے تھے۔

یہاں یہ یاد رہے کہ مفتی کفایت اللہ صاحب کے آبا و اجداد جد دراصل یمنی تھے۔ ہندوستان آ کر ان کے ایک بزرگ نے نائی کا پیشہ اختیار کیا۔ اس کا ایک خاص تاریخی پس منظر ہے، جس کے یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن ہماری اسلامی تاریخ میں یہ کوئی حیران کن بات نہیں ہے۔ کتنے ہی تیل بیچنے والے، کپڑا بننے والے، کپڑا رنگنے والے، جوتا گانٹھنے والے فقیہ اور محدث ہوئے اور پھر وہ نساج، خصاف، حلاج، دباغ، زیات، حلوائی وغیرہ کہلائے۔

بہرحال عرض یہ کرنا ہے کہ مولانا احمد الدین گکھڑوی کا خاندانی پس منظر اسلامی اور معاشرتی تاریخ کی رو سے بہت شان دار ہے۔

ذات برادی پر فخر کرنا نہ اخلاقی اعتبار سے درست ہے اور نہ شرعی اعتبار سے اسے کوئی اہمیت حاصل ہے۔ کتنے ہی ایسے لوگ ہیں جو دنیوی لحاظ سے اونچے خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن عمل و کردار میں نہایت پست ذہنیت کے مالک ہیں۔ اسی طرح بے شمار لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ ان کا شمار چھوٹی برادریوں میں ہوتا ہے، لیکن اللہ نے ان کو بلند مرتبے پر فائز کیا اور وہ علم و عمل کی دنیا میں بے حد ممتاز گردانے گئے۔



چوتھا باب

ولادت، حصولِ علم اور اساتذہ

مولانا احمد الدین گکھڑوی کی تاریخ ولادت کا صحیح طور سے تعین کرنا مشکل ہے۔ اس زمانے کے دیہات میں سرکاری سطح پر کوئی ایسا قانون یا رواج نہ تھا، جس کی رو سے کسی دفتر میں بچے کی تاریخ ولادت وغیرہ لکھنا لکھانا ضروری قرار دیا گیا ہو۔ اس قسم کے معاملات میں لوگوں کی یادداشت اور تخمینے پر اعتماد کیا جاتا تھا۔ ایک طریقہ یہ تھا کہ فلاں بچے کی ولادت اس وقت ہوئی تھی، جب فلاں واقعہ وقوع میں آیا اور فلاں حادثہ رونما ہوا تھا۔

مولانا احمد الدین کے آباو اجداد سیکڑوں سال سے گکھڑ میں رہ رہے تھے۔ ان کے والد کا نام حاجی اللہ دتا تھا۔ حاجی اللہ دتا کی شادی تحصیل وزیر آباد کے موضع جھاں والا میں ہوئی تھی۔ احمد الدین اپنے والدین کی پہلی اولاد تھے۔ ان کے بھتیجے مرزا محمد یونس کے بقول ان کی والدہ کا نام عمر بی بی تھا۔ اس عہد کے پنجاب میں پہلے بچے کی ولادت سے کچھ دن پیشتر والدین بیٹی کو اپنے گھر لے جاتے تھے اور پھر بچے کی ولادت سے سوا مہینے بعد اس کا شوہر بیوی اور بچے کو اپنے گھر لے آتا تھا۔ اس رواج کے مطابق عمر بی بی زچگی سے قبل اپنے میکے جھاں والا چلی گئی تھیں۔ احمد الدین کی ولادت وہیں ہوئی۔ اندازہ یہ ہے کہ وہ 1900ء کے پس وپیش پیدا ہوئے۔ قمری حساب سے یہ 1318ھ کے قریب بنتا ہے۔

حصولِ علم

مولانا احمد الدین گکھڑوی کے والد گرامی اور خاندان کے دیگر افراد میں نیکی اور صالحیت کے جذبات تو بے شک پائے جاتے تھے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کا علم کی طرف

رجحان کم تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں پتا نہیں چلتا کہ عمر کے ابتدائی دور میں احمد الدین کو کسی سرکاری سکول یا دینی مدرسے میں داخل کرایا گیا ہو۔ البتہ واقعات کی رفتار سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ والد نے بیٹے کو اپنے خاندانی پیشے آہن گری کے گر سمجھائے اور اس میں وہ ماہر ہو گئے۔ لیکن انھیں ذاتی طور پر علوم دینیہ کی تحصیل کا بے حد شوق تھا اور وہ اس شوق کی تکمیل کے لیے کمر بستہ ہوئے۔ نہایت ذہین تھے۔ انھوں نے اپنے روزمرہ کے آبائی کام کے ساتھ ساتھ تحصیل علم کا سلسلہ بھی شروع کر دیا اور اللہ نے انھیں کامیابی سے نوازا۔

اساتذہ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باقاعدہ طور پر کسی استاذ کی خدمت میں حاضر ہونے اور تعلیم کا آغاز کرنے سے پہلے انھوں نے کسی نہ کسی طرح ناظرہ قرآن مجید پڑھ لیا تھا اور کسی حد تک اردو زبان سے بھی آشنائی ہو گئی تھی۔

اب ان کے ان اساتذہ کے نام پڑھیے جن کا ہمیں علم ہو سکا ہے۔

1۔ میاں محکم الدین:

یہ گکھڑ منڈی کی مسجد تیلیاں والی اہل سنت والجماعت کے امام و خطیب تھے۔ مولانا احمد الدین نے ان سے فارسی کی کتابیں کریما، گلستاں اور بوستاں پڑھیں۔ نیز سکندر نامہ کا ابتدائی حصہ پڑھا۔ ان کتابوں سے انھیں فارسی زبان سے تعلق پیدا ہوا۔ ان کتابوں میں دینیات، اخلاقیات اور اصلاحِ نفس کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے، جس سے احمد الدین متاثر ہوئے اور پھر حصول علم کے میدان میں آگے قدم بڑھائے۔ دینی مدارس میں فارسی کی ان کتابوں کی تعلیم بالکل ابتدا میں نہیں دی جاتی، بلکہ یہ اسی بچے کو پڑھائی جاتی ہیں، جو پہلے سے قرآن مجید بھی پڑھ چکا ہو اور اردو بھی جانتا ہو۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ مولانا احمد الدین نے قرآن مجید پڑھ لیا تھا اور اردو سے بھی شد بد رکھتے تھے۔

2۔ سید محمد حسین:

ان سے صرف ونحو کی بعض کتابیں پڑھیں، وہ کتابیں ہیں صرف بہائی، صرف میر، ابواب الصرف، زنجانی، زرادی، مراح الارواح۔

3۔ مولانا علاء الدین:

ان سے منطق کی ابتدائی تین کتابیں ایساغوجی، قال اقول اور مرقات پڑھیں۔ کتبِ حدیث میں سے سننِ ابی داؤد اور جامع ترمذی کے ابتدائی حصے پڑھے۔

4۔ مولانا سلطان احمد:

یہ ضلع گوجرانوالا کے موضع نت کلاں کے رہنے والے تھے۔ حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کے شاگرد اور پنجابی کے شاعر تھے۔ حافظ عبدالمنان صاحب کے حالات میں انھوں نے پنجابی نظم میں کتاب لکھی۔ یہ پہلی کتاب ہے جو حضرت حافظ صاحب ممدوح کے حالات میں معرضِ تصنیف میں آئی۔ مولانا احمد الدین گکھڑوی نے ان سے صرف ونحو، منطق، فقہ، اصول فقہ، حدیث، اصول حدیث، عربی ادبیات، تفسیر قرآن اور دیگر مروجہ علوم پڑھے۔

مولانا سلطان احمد سے انھوں نے کس طرح تحصیل علم کی۔؟

سنیے اور استاد اور شاگرد کو داد دیجیے!

جب احمد الدین اپنے آبائی کام سے فارغ ہوتے، گرمی ہو یا سردی، آندھی ہو یا بارش، کتابیں پکڑتے اور موضع نت کلاں کو روانہ ہو جاتے۔ گکھڑ سے نت کلاں دو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہ سفر وہ پیدل طے کرتے تھے۔ علم کا یہ بے پناہ شوق تھا، جس کی وجہ سے انھیں گرمی، سردی، بارش، آندھی وغیرہ کا کوئی احساس نہ ہوتا تھا۔

مولانا سلطان احمد کا کام بافندگی تھا۔ وہ کھڈی میں بیٹھ کر کپڑا بنتے تھے۔ اب یہ حضرات انصاری کہلاتے ہیں۔ کھڈیوں میں بیٹھ کر کپڑا بنانے کا سلسلہ عرصہ ہوا ختم ہو گیا ہے۔

اس زمانے میں کھڈیوں پر کپڑا بنانے والے انصاری (یا با فندے) گلی میں تانا بانا لگایا کرتے تھے۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ دونوں طرف زمین میں کیل ٹھوک لیتے۔ ایک طرف کا فاصلہ تقریباً دو سو گز کا ہوتا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں لکڑی کی باریک سی سوئیاں ہوتی تھیں، جن کے سروں پر سوت کے نڑے ہوتے تھے۔ وہ تانا بنتے تو دونوں طرف آنے جانے کا فاصلہ چار سو گز کے لگ بھگ ہو جاتا تھا۔ اس طرح چلتے چلتے وہ مولانا احمد الدین کو پڑھاتے تھے۔ شاگرد بھی ان کے ساتھ ساتھ چلتے اور سبق پڑھتے۔ استاد اگر کام سے فارغ ہوتے تو مسجد میں بیٹھ کر پڑھاتے۔ وہ طالب علم کی پڑھائی کا پورا خیال رکھتے تھے۔ اس کا وقت ضائع نہیں ہونے دیتے تھے۔

مولانا احمد الدین پندرہ سولہ سال کے تھے کہ ان کے والد گرامی حاجی اللہ دتا وفات پا گئے۔ یہ بہت بڑا صدمہ تھا جو انھیں برداشت کرنا پڑا۔ باپ کے بڑے بیٹے ہونے کی وجہ سے ان پر گھر کی ذمہ داریاں بھی آپڑی تھیں۔ لیکن انھوں نے ان غم ناک اور تکلیف دِہ حالات میں بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔

تعلیم کے دوران ہی میں مولانا احمد الدین کو وعظ وتقریر کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ وہ بدعات اور غیر اسلامی رسوم ورواج کے سخت خلاف تھے اور ان پر کھل کر تنقید کرتے تھے۔ ذہن ابتدا ہی سے مناظرانہ تھا۔ اسلامی احکام کے سلسلے میں جس سے بات کرتے، پورے زور سے کتاب وسنت کی روشنی میں کرتے۔ اس ضمن میں کسی قسم کا خوف یا کسی نوع کا لحاظ کبھی ان کے ذہن میں نہ آیا۔ صدقِ مقال، احقاقِ حق اور ابطالِ باطل ہمیشہ ان کا شیوہ رہا۔

ان کے استاذ مولانا سلطان احمد اس دور کے معاشرے اور اس نواح میں نہایت عزت کا مقام رکھتے تھے۔ اپنے ہاتھ سے کما کر گزر اوقات کرتے تھے۔ تدریس اور امامت وخطابت کا کسی سے کوئی معاوضہ نہیں لیتے تھے۔ وہ حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کے شاگرد تھے اور استاذِ محترم کی تربیت کی بنا پر تمام عمر برسرِ عام حق گوئی اور غلط امور کی تردید ان

کا مرکزی نقطۂ فکر رہا۔ نہایت افسوس ہے، ان کے تفصیلی حالات کا علم نہ ہو سکا۔ ان کے اخلاف اور رشتے داروں میں سے یقیناً کچھ لوگ موجود ہوں گے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے شاگردوں کی اولاد میں سے کچھ افراد زندہ ہوں۔ اگر یہ لوگ اپنے عالم دین بزرگ اور مخلص ترین استاذ کے تھوڑے بہت حالات سے آگاہ ہوں تو اس کا تذکرہ جماعت اہل حدیث کے کسی اخبار میں ضرور کرنا چاہیے۔

مولانا احمد الدین گکھڑوی ہمیشہ علم کی تلاش میں رہے۔ قیام پاکستان کے بعد انھوں نے حضرت حافظ عبداللہ روپڑی اور مولانا شریف اللہ خاں سواتی سے بھی استفادہ کیا۔

اب آئندہ سطور میں ان کے ان اساتذہ کے مختصر حالات بیان کیے جاتے ہیں، جن کا ہمیں پتا چل سکا۔

5۔ مولانا علاء الدین:

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ مولانا احمد الدین گکھڑوی کچھ عرصہ گوجراں والا میں مولانا علاء الدین کے حلقۂ درس میں بھی رہے۔ مولانا علاء الدین برہمن چندر بنسی خاندان کے فرد تھے۔ ان کی نویں پشت میں ایک شخص غالب دین نے اسلام قبول کیا۔ مولانا علاء الدین 1823ء کے پس وپیش موضع پنڈوریاں تحصیل وزیر آباد (ضلع گوجراں والا) میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام عبدالواسع تھا۔

مولانا علاء الدین نے حصولِ علم کا آغاز حضرت مولانا غلام رسول (قلعہ میہاں سنگھ والا) سے کیا۔ پھر دہلی جا کر حضرت میاں سید نذیر حسین کے دائرۂ تلمذ میں شامل ہوئے۔ بہت اچھے خطیب اور واعظ تھے۔ تکمیل تعلیم کے بعد ہندوستان کے بعض علاقوں میں وعظ وتذکیر اور درس وتدریس کی خدمت انجام دیتے رہے۔ 1875ء کے قریب گوجراں والا آئے اور یہاں کی اونچی مسجد کمہاراں والی میں خطیب مقرر کیے گئے۔ لیکن اہل حدیث مسلک سے تعلق کی وجہ سے انھیں اس مسجد سے نکال دیا گیا۔ اسی اثنا میں چوک نیائیں میں

جامع مسجد اہل حدیث بنائی گئی تو انھیں اس مسجد کے امام وخطیب مقرر کر دیا گیا۔ انھوں نے 98 سال کی عمر کو پہنچ کر 6۔ستمبر 1921ء (3۔محرم 1340ھ) کو وفات پائی۔ ان کی زندگی ہی میں 1921ء کو اس مسجد کے منصبِ خطابت پر حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی فائز کر دیے گئے تھے۔

6۔ مولانا شریف اللہ خاں:

مولانا احمد الدین گکھڑوی نے قیام پاکستان کے بعد مولانا شریف اللہ خاں سواتی سے بھی استفادہ کیا اور ان سے کتاب سلم العلوم پڑھی۔ لہٰذا اب مولانا شریف اللہ خاں صاحب کے بارے میں چند الفاظ پڑھیے۔

مولانا شریف اللہ خاں 1890ء (1307ھ) کو علاقہ سوات کے قصبہ عالی گرامہ نیک پخیل میں پیدا ہوئے۔ وہ پٹھانوں کے قبیلہ یوسف زئی سے تعلق رکھتے تھے۔ والد کا اسم گرامی مولانا مفتی فقیہ اللہ خاں تھا۔ چھوٹی عمر میں والدین کے سایۂ محبت سے محروم ہو گئے تھے۔ ان کے ماموں مولانا حنیف اللہ خاں سابق ریاست دیر کے منصبِ قضا پر فائز تھے، مولانا شریف اللہ نے ان سے بعض درسی کتابیں پڑھیں اور انہی نے ان کی پرورش کی۔

1906ء (1324ھ) کو مولانا شریف اللہ خاں رام پور کے مدرسہ عالیہ میں داخل ہوئے۔ نو سال وہاں تعلیم حاصل کی اور سندِ فراغت لی۔ رام پور میں انھوں نے جن اساتذہ سے استفادہ کیا، ان میں مولانا فضل حق رام پوری بھی شامل ہیں۔

رام پور سے وہ دارالعلوم دیوبند گئے۔ وہاں مولانا محمود حسن صاحب سے شرفِ شاگردی حاصل کیا اور ان سے تبرکاً دوبارہ صحیح بخاری پڑھی۔

تحصیل علم کے بعد رام پور کے مدرسہ ارشاد العلوم میں سلسلۂ تدریس شروع کیا۔ کچھ عرصہ وہاں رہے۔ پھر لکھنؤ کے ایک مدرسے میں پڑھانے لگے۔ پانچ سال وہاں خدمت سرانجام دی۔ پھر دہلی آ گئے اور مدرسہ عالیہ فتح پوری سے وابستگی اختیار کر لی۔ کچھ عرصہ وہاں

نائب مدرس کے طور کام کیا، پھر صدر مدرس بنا دیے گئے۔ اس زمانے میں وہ مدرسہ رحمانیہ میں بھی طلبا کو بعض کتابوں کا درس دیتے تھے۔ دہلی کے زمانۂ قیام میں ان سے جن سیکڑوں علما وطلبا نے حصولِ فیض کیا، ان میں مولانا محمد جونا گڑھی دہلوی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی بھی شامل ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد لاہور آگئے اور ان کی خدمات دارالعلوم تقویۃ الاسلام کے لیے مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے حاصل کرلیں۔ تقسیم ملک کے نتیجے میں یہ دارالعلوم امرتسر سے لاہور منتقل ہو گیا تھا۔ کئی سال وہ اس دارالعلوم میں پڑھاتے رہے۔ پھر 1955ء میں فیصل آباد میں جامعہ سلفیہ کا قیام عمل میں آیا تو ان سے جامعہ سلفیہ میں فریضۂ درس دینے کی درخواست کی گئی جو انھوں نے منظور فرمائی اور وہ فیصل آباد تشریف لے گئے۔ وہیں ان پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ لاہور آ گئے۔

اس عالم دین نے جمعۃ المبارک کے روز 31۔ اگست 1979ء (7۔ شوال 1399ھ) کو لاہور میں وفات پائی اور انھیں قبرستان میانی صاحب میں دفن کیا گیا۔

7۔ حضرت حافظ عبداللہ روپڑی:

مولانا احمد الدین گکھڑوی جن حضرات سے کسی نہ کسی سطح پر مستفید ہوئے ان میں ایک ممتاز عالم دین حضرت حافظ عبداللہ روپڑی ہیں۔ حافظ صاحب کا شمار جماعت اہل حدیث کے مشہور علمائے کرام اور نامور ماہرینِ علومِ حدیث میں ہوتا ہے۔ وہ 1304ھ (1887ء) کو موضع کیر پور (ضلع امرتسر) میں پیدا ہوئے۔ والد کا اسم گرامی میاں روشن دین تھا۔ موضع ڈوبہ تحصیل چونیاں (ضلع قصور) میں تعلیم کا آغاز کیا۔ چھانگا مانگا (ضلع قصور) کے مولوی عبداللہ سے آٹھ پارے حفظ کیے۔ کچھ عرصے کے بعد لکھو کے چلے گئے۔ وہاں اس زمانے میں استاذِ پنجاب مولانا عطاء اللہ لکھوی کے والد مکرم مولانا عبدالقادر لکھوی کا سلسلۂ درس جاری تھا، ان سے صرف ونحو کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ بعد ازاں امرتسر کے

مدرسہ غزنویہ میں حضرت الامام سید عبدالجبار غزنوی اور دیگر اساتذہ سے اکتسابِ فیض کیا۔ 1910ء (1328ھ) میں عازمِ دہلی ہوئے اور وہاں مولانا محمد اسحاق منطقی سے مروجہ نصاب کی بعض کتابیں پڑھیں۔ مدرسہ عالیہ رام پور میں بھی داخلہ لیا اور مختلف فنون کی انتہائی درجے کی بعض کتابوں کی تکمیل اس مدرسے کے اساتذہ سے کی۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد 1914ء (1331ھ) میں روپڑ کی جماعت اہل حدیث کی درخواست پر روپڑ تشریف لے گئے۔ وہاں بے حد علمی خدمات سرانجام دیں۔ بہت لوگوں نے ان سے تحصیل علم کی۔ روپڑ سے ہفت روزہ اخبار "تنظیم اہل حدیث" جاری کیا۔ چھوٹی بڑی تقریباً پچاس کتابیں تصنیف کیں جو خالص علمی اور تحقیقی نوعیت کی ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد اپنے خاندان سمیت لاہور آ گئے۔ یہاں برانڈرتھ روڈ اور ریلوے روڈ کے سنگم پر (چوک دال گراں میں) بہت بڑی مسجد تعمیر کرائی اور اس میں جامعہ قدس کے نام سے دارالعلوم جاری کیا، جس میں بہت سے اصحابِ علم نے ان سے تحصیل علم کی۔

لاہور آ کر اپنا پرانا اخبار "تنظیم اہل حدیث" بھی جاری کیا۔

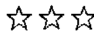
اس رفیع المنزلت عالم دین نے 20۔اگست 1964ء (11۔ربیع الاول 1384ھ) کو لاہور میں وفات پائی اور گارڈن ٹاؤن کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔

ان کی جاری کردہ جامعہ قدس نے تدریسی اعتبار سے بڑی ترقی کی۔ اب اسے ان کے لائق اخلاف میں سے مولانا حافظ عبدالغفار روپڑی اور مولانا حافظ عبدالوہاب روپڑی نہایت کامیابی سے چلا رہے ہیں۔

یہ ہیں وہ حضراتِ علمائے کرام جن سے مولانا احمد الدین گکھڑوی نے مختلف اوقات میں استفادہ کیا۔ کسی سے صرف ونحو کی کتابیں پڑھیں، کسی سے حدیث اور علومِ حدیث پڑھے، کسی سے منطق اور فلسفے کی کتابیں پڑھیں، کسی سے فارسی کی کتابیں پڑھیں۔

ان کا ذہن چوں کہ ابتدا ہی سے مناظرانہ تھا اور مناظرے میں حریف ہر قسم کے سوال کرتا اور ہر طریقے سے اپنے مدِ مقابل کو گھیرنے کی کوشش کرتا ہے، کبھی فلسفیانہ انداز میں بات کرتا ہے، کبھی علم منطق کے سوال پوچھے جاتے ہیں، کبھی صرف ونحو اور معانی و بیان کی باتیں کی جاتی ہیں، کبھی عربی ادبیات کے متعلق تبادل خیال ہوتا ہے۔ کبھی اصولِ حدیث اور اصولِ فقہ کی اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں۔ اس لیے مولانا احمد الدین نے ان تمام علوم کی ماہر اساتذہ سے تحصیل کی اور بڑی محنت اور دلچسپی سے کی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مناظرے کے ہر میدان میں حریف کا دلائل کی پوری قوت سے مقابلہ کیا اور کسی سے کبھی شکست نہیں کھائی۔

یہاں یہ وضاحت کرنا ضروری ہے کہ حاجی اللہ دتا کی نرینہ اولاد تین بیٹے تھے، جن کی ترتیبِ ولادت یہ ہے: سب سے بڑے مولانا احمد الدین، ان سے چھوٹے میاں فضل احمد اور سب سے چھوٹے مستری عبداللہ۔ لیکن ان میں سے عالم دین صرف مولانا احمد الدین ہوئے اور انھوں نے علم کی وجہ سے ملک میں بڑی شہرت پائی۔ یہ سب حضرات سفرِ آخرت پر روانہ ہو چکے ہیں۔ معلوم نہیں ان کی اولاد میں سے کوئی صاحب اپنے بزرگوں کے متعلق کچھ معلومات رکھتے ہیں یا نہیں۔ مولانا احمد الدین کی تو کوئی اولاد نہ تھی۔ ان کی شادی سگی خالہ کی بیٹی محمد بی بی سے ہوئی تھی، لیکن تین سال بعد انھوں نے طلاق دے دی۔ اس اثنا میں کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ پھر جوان عمر کے باوجود مولانا نے شادی نہیں کی۔ کیوں طلاق ہوئی؟ اور کیوں دوسری شادی نہیں کی؟ اس کے متعلق ہمیں کچھ پتا نہیں اور نہ پتا کرنے کی ضرورت ہے۔



پانچواں باب

مولانا احمد الدین مناظر کی حیثیت سے

مولانا احمد الدین گکھڑوی بہت بڑے مناظر اور جلیل القدر عالم تھے۔لیکن یہ ایک الم ناک حقیقت ہے کہ ان کی مختلف علمی مساعی کا تفصیلی تذکرہ ابھی تک کسی نے نہیں کیا۔ان کی وفات پر ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔بے شمار لوگ موجود ہیں، جن سے ان کی ملاقاتیں رہیں اور جنھوں نے ان کی تقریریں سنیں، جو ان کے خطباتِ جمعہ میں حاضر ہوتے رہے اور جنھوں نے ان کی اقتدا میں نمازیں پڑھیں، ان کی مجلسوں میں بیٹھے،لیکن ان میں کوئی ایسا شخص نہیں جو ان کی زندگی کے تفصیلی واقعات خاص ترتیب کے ساتھ بتا سکے، جس سے پوچھو، یہی جواب آئے گا کہ فلاں مسجد میں جمعہ پڑھایا کرتے تھے اور بڑی اچھی تقریر کرتے تھے۔عیسائیوں کے ساتھ مناظرے کرتے تھے اور مرزائیوں سے ان کے مباحثے ہوتے تھے۔لیکن مناظروں اور مباحثوں کا زیادہ تفصیل سے کوئی بھی ذکر نہیں کرتا۔نہ کوئی خطباتِ جمعہ کی وضاحت کو موضوعِ سخن ٹھہراتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ مولانا احمد الدین کو نہ خود اپنے حالات لکھنے لکھانے کا خیال تھا، نہ اپنے مناظروں اور مباحثوں سے متعلق زیادہ باتیں کرنے کی عادت تھی اور نہ ان سے ملنے والوں میں سے کسی نے ان کے بارے میں معلومات ضبطِ تحریر میں لانے کی کوشش کی۔پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ وہ کہیں جم کر نہیں بیٹھے اور کسی ایک مقام کو اپنا مرکزِ تبلیغ نہیں بنایا۔وہ طبیعت کے گرم تھے یا یوں کہیے کہ بے حد خود دار تھے، کسی سے کوئی ایسی بات نہیں سن سکتے تھے جس سے ان کی طبعِ نازک پر ذرہ بھی زد پڑتی ہو، جب کہ جماعتی زندگی کے طویل سفر میں

کبھی خوش گوار واقعات کی حسین وادیوں سے گزرنے کے مواقع میسر آتے ہیں اور کبھی ناخوش گوار منزلوں کو عبور کرنا پڑتا ہے۔لیکن انھیں اس کی پروانہ تھی۔

انھوں نے نہ کہیں مستقل طور سے خطابت وامامت کی، نہ زیادہ عرصہ درس وتدریس کا فریضہ سرانجام دیا۔اپنے آبائی شہر گکھڑ کو بھی مرکز نہ بنایا۔وہ بہت ذہین تھے اور دینیات سے متعلق ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور وسعتِ مطالعہ نے ان کو اجتہاد کی راہ پر لگا دیا تھا۔لیکن استقلال کی کمی کے باعث وہ کسی ایک مقام کو اپنی سرگرمیوں کا محور نہ قرار دے سکے اور ان کی تدریسی اور خطابتی صلاحیتوں سے لوگوں کو بہت زیادہ فائدہ اٹھانے کا موقع نہ ملا۔اس قسم کے عالی مرتبت لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔کاش ان کی پُرخلوص جدوجہد کی پوری تفصیل معرضِ کتابت میں آئی ہوتی اور ہم لوگوں کو اس سے استفادے کا موقع ملا ہوتا۔تاہم محنت کرکے اللہ کے فضل سے ہمیں بہت کچھ مل گیا اور ان کی زندگی کے بے شمار واقعات ہمارے علم میں آئے۔ان کی علمی سرگرمیوں کی تفصیل بھی نظر وبصر کے زاویوں میں آئی اور ان کے مختلف مقامات کے مناظروں کے بارے میں بھی ایسی ایسی معلومات میسر آئیں، جن سے ہم بالکل ناآشنا تھے۔الحمد للہ علیٰ ذالک۔

تقسیم ملک سے قبل میں نے ان کے دو مناظرے سنے تھے۔کتبِ حدیث پر ان کی گہری نظر تھی۔وہ اگرچہ باقاعدہ مدرس اور مصنف نہ تھے، لیکن تفسیر وحدیث اور دوسرے علوم کی تمام اہم کتابیں ان کے زیرِ مطالعہ رہتی تھیں۔وہ نہایت صفائی سے بات کرتے اور حریف کے اعتراضات کا وضاحت کے ساتھ زوردار الفاظ میں جواب دیتے تھے۔انھوں نے مختلف مذاہب کے اہل علم سے بیسیوں مناظرے کیے۔بے شک بعض اوقات پُرخلوص طیش میں آکر ان کی زبان سے کچھ ایسے کلمات نکل جاتے تھے، جنھیں عوامی نوعیت کے کلمات سے تعبیر کرنا چاہیے۔اس قسم کے کلمات سے لوگ بہت خوش ہوتے اور خوشی کے ساتھ اپنی مجلسوں میں بیان کرتے تھے۔واقعہ یہ ہے کہ حریف ان کا سامنا کرنے سے

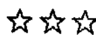
گھبراتے تھے۔ ان کے دلائل کا توڑ بہت مشکل تھا اور ان کے مقابلے میں قدم جما کر کھڑے رہنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔

کامیاب مناظر وہی ہوتا ہے، جس کا مقابلہ کرنے سے حریف گریز کی راہیں تلاش کرے اور اسے دیکھ کر اضطراب کی کیفیت میں مبتلا ہو جائے۔ مولانا احمد الدین کا یہ کمال تھا کہ وہ حریف پر حملہ کرتے اور اپنے حق میں دلائل دیتے تو اس میں نہ ان کا حملہ برداشت کرنے کی طاقت ہوتی تھی اور نہ ان کے دلائل کا صحیح جواب اس کے پاس ہوتا تھا۔

میں نے زیادہ مناظرے نہیں سنے۔ صرف دو مناظرے مولانا احمد الدین کے سنے ہیں، جن کا ذکر آگے آئے گا اور دو مناظرے حافظ عبدالقادر روپڑی کے سنے ہیں۔ ایک مناظرہ حافظ صاحب نے ہمارے شہر کوٹ کپورہ میں قادیانی مناظر سے کیا تھا اور ایک ریاست فرید کوٹ کے ایک گاؤں دلیپ سنگھ والا میں بریلوی مسلک کے عالم مولانا محمد عمر اچھروی سے کیا تھا۔ یہ چاروں مناظرے تقسیم ملک سے کئی سال پہلے سننے کا موقع ملا تھا۔

میرا خیال ہے اس دور کے (ایک دو کے سوا) تمام مناظرین سے مولانا احمد الدین گکھڑوی کا طریقِ مناظرہ زیادہ کامیاب بلکہ کہنا چاہیے کہ مدِ مقابل کے لیے بے حد خطرناک تھا۔ مخالفانہ اور موافقانہ دلائل اس تیزی سے ان کے منہ سے نکلتے تھے کہ سننے والا حیران رہ جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ عبدالقادر روپڑی انھیں استاذ المناظرین قرار دیتے ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ان کے مناظروں کی پوری روداد ہمارے سامنے نہیں ہے۔ جو کچھ معلوم ہوا، آئندہ صفحات میں بیان کیا جا رہا ہے۔ اس سے ساری روداد واضح ہو جاتی ہے۔

آئندہ صفحات میں پہلے ان چند مناظروں کا ذکر کیا جاتا ہے جو انھوں نے حضرات احناف کے بریلوی علمائے کرام سے کیے۔ پھر ان مناظروں کا تذکرہ کیا جائے گا جو مرزائیوں، شیعوں اور عیسائیوں کے مناظرین سے کیے۔



چھٹا باب

علماے احناف سے مناظرے

اس باب میں مولانا احمد الدین گکھڑوی کے ان مناظروں کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو انھوں نے مختلف مقامات میں (بریلوی) علماے احناف سے کیے۔

ضلع فیروز پور کے ایک گاؤں میں مناظرہ

1936ء کی بات ہے، جب استاذِ مکرم حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کوٹ کپورہ (ریاست فرید کوٹ) میں خطابت و تدریس کا فریضہ سرانجام دیتے تھے، اس وقت ضلع فیروز پور کے ایک گاؤں میں (جس کا نام لکھاں والا تھا) ایک اہل حدیث عالم دین مولانا محمد عباس قیام فرماتے تھے۔ وہ اس نواح کے مشہور خطیب اور مدرس تھے۔ وہاں احناف کے بریلوی نقطۂ نگاہ کے ایک عالم نے اشتہار شائع کیا کہ دیہات میں جمعہ نہیں پڑھنا چاہیے۔ ’’صلوۃ الجمعہ فی القریٰ‘‘ ایک ایسا موضوع تھا، جس پر اس زمانے میں بحثوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ احناف دیہات میں جمعہ پڑھنے کی شدید مخالفت کرتے تھے اور اہل حدیث دیہات میں جمعہ پڑھنے کو قرآن وحدیث کی روشنی میں ضروری قرار دیتے تھے۔ اس مسئلے پر تحریری اور تقریری صورت میں فریقین کے درمیان بحثیں ہوتی رہتی تھیں۔

مولانا محمد عباس ایک دن مولانا عطاء اللہ صاحب بھوجیانی کی خدمت میں آئے اور فرمایا کہ انھوں نے اس موضوع پر بریلوی حضرات سے مناظرے کی تاریخ مقرر کر لی ہے۔ آپ کسی اہل حدیث مناظر کا انتظام کر دیں اور خود بھی اس مجلس مناظرہ میں شرکت فرمائیں۔ مولانا عطاء اللہ صاحب نے مولانا احمد الدین گکھڑوی سے رابطہ کیا اور وہ تاریخ

مقررہ پر تشریف لے آئے۔ کھلے میدان میں مناظرے کا انتظام کیا گیا تھا۔ بہت بڑا مجمع تھا۔ دیہات کے بے شمار لوگ مناظرہ سننے آئے تھے۔ ہم لوگ کوٹ کپورہ سے بس پر گئے تھے۔ اس علاقے میں یہ پہلا مناظرہ تھا۔

بریلوی حضرات کی طرف سے مناظر گوندلاں والا کے مولانا محمد حسین تھے اور ان کے صدر مناظرہ تھے ملتان کے ایک عالم دین، جنھیں ''ملا ملتانی'' کہا جاتا تھا۔ ان کا اصل نام میرے ذہن میں نہیں رہا، عبدالعزیز تھا یا نظام الدین۔ وہ بڑے لسان عالم تھے اور فنِ مناظرہ کے ماہر۔

اہل حدیث کی طرف سے مناظر تھے مولانا احمد الدین گکھڑوی۔ میں نے ان کو پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ نکلتا ہوا قد، کسرتی سا متناسب جسم، نہ موٹے نہ دبلے پتلے، سرخی مائل گندمی رنگ، قدرے لمبا چہرہ، سر پر سفید عمامہ، تہبند اور قمیص پہنے ہوئے، کندھوں پر رومال۔ داڑھی قدرتی طور سے مختصر۔ نظر کمزور تھی اور کتاب آنکھوں کے بالکل قریب کر کے پڑھتے تھے۔

مناظر صاحبان اور صدور مناظرہ کے لیے میز کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ دونوں طرف کے مناظر تھوڑے سے فاصلے پر آمنے سامنے تھے۔

مجمعِ عام میں پہلے کسی صاحب نے وضاحت سے موضوعِ مناظرہ کا اعلان کیا اور دونوں مناظر عالموں کے نام بتائے۔ نیز بتایا کہ ہر مناظر صاحب اپنی اپنی باری سے پانچ پانچ منٹ تقریر کریں گے۔

مناظرہ اس طرح شروع ہوا کہ پہلے حنفی مناظر مولانا محمد حسین نے دلائل دیے کہ دیہات میں جمعہ نہیں پڑھنا چاہیے۔ اگر کہیں پڑھا جائے تو جمعے کے بعد احتیاطاً نمازِ ظہر پڑھنی چاہیے، جسے عرفِ عام میں ''احتیاطی'' کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد مولانا احمد الدین گکھڑوی کی باری آئی۔ انھوں نے قرآن و حدیث کے حوالوں سے ثابت کیا کہ شہروں اور قصبوں میں بھی جمعہ پڑھنا فرض ہے اور دیہات میں بھی

جمعے کی ادائیگی ضروری ہے۔

ان کے بعد ایک مرتبہ پھر پانچ منٹ مولانا محمد حسین نے تقریر کی۔ وہ تقریر ختم کر چکے تو مولانا احمد الدین گکھڑوی نے پانچ منٹ جوابی تقریر کی، جس میں انھوں نے اپنے موقف کی تائید میں حوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

مولانا احمد الدین گکھڑوی کی تقریر کے بعد مولانا محمد حسین کھڑے ہوئے اور صاف الفاظ میں پنجابی میں کہا "تسیں جتے، اسیں ہارے"۔ یعنی آپ لوگ جیتے اور ہم ہار گئے۔ یہ الفاظ کہہ کر وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔ ان کے یہ پنجابی الفاظ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہے ہیں اور میں انھیں کرسی پر بیٹھتے اور اٹھتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔

پورے مجمعے کے لیے ان کے یہ الفاظ حیرت اور تعجب کا باعث تھے اور یہ کہہ کر ان کا بیٹھنا بے حد حیران کن تھا۔ ان کے صدر ملا ملتانی صاحب بھی یہ الفاظ سن کر نہایت متعجب ہوئے اور انھوں نے بار بار ان سے کہا کہ اٹھو مولوی احمد الدین کی باتوں کا جواب دو۔ لیکن وہ نہیں اٹھے۔ درحقیقت وہ مولانا احمد الدین کے پیش کردہ حوالوں کے بوجھ تلے پوری طرح دب گئے تھے اور سامعین محسوس کر رہے تھے کہ ان کا اس بوجھ سے نکلنا مشکل ہے، چنانچہ یہی ہوا۔

مجمعے میں کسی طرف سے کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ سب لوگ آرام سے بیٹھے رہے۔ مولانا احمد الدین گکھڑوی بھی حیرانی کے عالم میں خاموش بیٹھے اپنے حریف مولانا محمد حسین کی طرف دیکھ رہے تھے۔

اس کے بعد مجمعے سے آوازیں بلند ہونے لگیں: اہل حدیث جیت گئے...... وہابی جیت گئے...... حنفی ہار گئے...... وہابی مولوی کا حنفی مولوی مقابلہ نہ کر سکا...... وہابی مولوی جیت گیا...... حنفی مولوی ہار گیا...... دیہات میں جمعہ پڑھنا فرض ہو گیا...... نہ پڑھنے والا گناہ گار ہو گا...... اس قسم کی آوازیں ہر طرف سے مسلسل آ رہی تھیں اور زور زور سے آ رہی تھیں۔

پھر لوگ مولانا احمد الدین گکھڑوی کی طرف دوڑے اور ان سے سلام و مصافحے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بعض لوگ ان کے ہاتھ چومنے لگے۔ بعض نے ان کا ماتھا بھی چوما۔

اس مناظرے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس علاقے کے تقریباً تمام دیہات میں باقاعدہ نمازِ جمعہ پڑھی جانے لگی اور لوگوں کی بہت بڑی تعداد نے مسلکِ اہل حدیث اختیار کر لیا۔

مولانا محمد عباس جن کی کوشش سے یہ مناظرہ ہوا تھا، قیامِ پاکستان کے بعد پاک پٹن آ گئے تھے اور انھیں وہاں کی مسجد اہل حدیث کے خطیب و امام مقرر کر لیا گیا تھا۔ محققانہ ذہن کے سلجھے ہوئے عالم دین تھے۔ میرے زمانۂ ادارت میں ہفت روزہ ''الاعتصام'' میں بعض علمی موضوعات پر ان کے مضامین چھپتے رہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے انھوں نے پاک پٹن ہی میں وفات پائی۔ پاکپتن میں تقسیم ملک سے کئی سال قبل اہل حدیث کی پہلی مسجد چودھری عبدالرحمٰن کی کوشش سے بنی تھی جو مولانا کرم الٰہی (ساکن قادر والا تحصیل زیرہ ضلع، فیروز پور) کے فرزند گرامی تھے اور پاکپتن کے گورنمنٹ ہائی سکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ قیام پاکستان کے بعد فوت ہوئے۔ نہایت نیک گھرانے کے نیک فرد تھے۔

معلوم نہیں یہ سطور مولانا محمد عباس کے اخلاف یا ان کے شاگردوں میں سے کسی کے مطالعہ میں آئیں گی یا نہیں۔ اگر کوئی صاحب ان کے تھوڑے بہت حالات سے مطلع کر سکیں تو میں ان کا شکر گزار ہوں گا۔ وہ نہایت متین اور معتدل مزاج عالم تھے اور میرے مہربان تھے۔ اگر ان کے تھوڑے بہت حالات مل جائیں تو میں ان پر مضمون لکھنا چاہتا ہوں۔

مولانا احمد الدین گکھڑوی بلا شبہ کامیاب مناظر تھے اور اپنے موقف کے حق میں دلائل دیتے وقت ہر کتاب کی عبارت (وہ عربی ہوتی یا اردو) پڑھتے اور اس کے صفحے، سطر اور مقام اشاعت و سال طباعت کا حوالہ دیتے۔ صاف الفاظ میں وضاحت سے بات کرتے تھے۔ ان کی گفتگو میں کسی قسم کا الجھاؤ نہیں ہوتا تھا۔

ویروالی (ضلع سیالکوٹ)

یہ ضلع سیالکوٹ کا ایک گاؤں ہے جہاں 1931ء میں مناظرہ ہوا تھا۔ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ مناظرے کا موضوع کیا تھا۔ اس میں اہل حدیث کی طرف سے مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا نور حسین گھرجاکھی، سید عبدالرحیم شاہ مکھوی اور مولانا احمد الدین گکھڑوی شامل تھے اور احناف کے بریلوی صاحبان کی طرف سے ملتان کے ملا ملتانی اور مولانا نادر شاہ شریک تھے۔ مناظرہ ملا ملتانی اور سید عبدالرحیم شاہ کے درمیان ہوا تھا۔ مولانا احمد الدین گکھڑوی نے مختلف کتابوں سے سید عبدالرحیم شاہ کو ضروری حوالے نکال کر دیے تھے۔ اس اعتبار سے وہ شاہ صاحب کے معاون تھے۔

مناظرہ گوجراں والا

یہ مناظرہ گوجراں والا میں بڑے قبرستان کے قریب ہوا تھا۔ مناظرے کی تاریخ اور موضوع کا پتا نہیں چل سکا۔ مناظرہ اہل حدیث اور بریلوی حضرات کے درمیان ہوا تھا۔ اہل حدیث کے مناظر مولانا احمد الدین تھے اور ان کے معاون تھے مولانا نور حسین گھرجاکھی۔ بریلوی صاحبان کے مناظر مولانا محمد عمر اچھروی تھے۔ گوجراں والا کا یہ اس عہد کا مشہور مناظرہ تھا، جس میں دونوں مذہبی جماعتوں کے بے شمار لوگ بڑی دلچسپی اور انتہائی شوق سے شامل ہوئے تھے۔

داووالی (ضلع گوجراں والا)

داووالی یا کسی اور مقام میں مناظرہ ہوا۔ اس مناظرے میں اہل حدیث کی طرف سے مناظر مولانا احمد الدین گکھڑوی تھے اور ان کے معاون مولانا محمد اسماعیل سلفی تھے۔ بریلوی حضرات کے مناظر مولانا عبدالغفور ہزاروی تھے اور ان کے معاون تھے مفتی احمد یار خاں گجراتی۔

مناظرے کا موضوع تھا علم غیب، حاضر و ناظر اور نور و بشر۔ یعنی بریلوی حضرات کا

موقف یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب کا علم حاصل تھا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہر جگہ تشریف فرما ہیں اور سب کچھ دیکھ اور سن رہے ہیں اور یہ کہ آپ بشر نہیں، نور تھے۔ اس کے برعکس اہل حدیث مناظر کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو علمِ غیب حاصل نہیں تھا۔ غیب کی باتیں صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے، کوئی انسان نہیں جانتا۔ یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ موجود بھی نہیں ہیں اور نہ ہر چیز دیکھ اور سن رہے ہیں اور آپ نور نہیں، بشر تھے، یعنی اللہ کے مقدس ترین بندے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو بندوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا تھا۔

اس مناظرے کے موقعے پر فریقین کے درمیان جھگڑا بھی ہو گیا تھا اور ایک شخص عبداللہ نے جو بریلوی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتا تھا، مولانا احمد الدین گکھڑوی پر حملہ کر کے انھیں برا بھلا بھی کہا تھا۔ اس سے کچھ عرصے بعد وہ شخص اہل حدیث ہو گیا تھا اور جو ناروا سلوک اس نے مولانا احمد الدین سے کیا تھا، اس پر وہ نہایت ندامت اور افسوس کا اظہار کیا کرتا تھا۔

اس مناظرے کا اثر یہ ہوا کہ متعدد بریلوی حضرات نے مسلک اہل حدیث قبول کر لیا تھا۔

مولانا محمد سرفراز سے گفتگو

مشہور دیوبندی عالم مولانا سرفراز خاں صفدر کا تعلقِ سکونت گکھڑ سے تھا۔ وہ بہت سی کتابوں کے مصنف اور معروف مدرس تھے۔ مولانا احمد الدین کا مسکن بھی گکھڑ تھا۔ سنا ہے کہ ان کا آپس میں کبھی جھگڑا نہیں ہوا تھا۔ البتہ ایک مرتبہ سورہ فاتحہ خلف الامام کے مسئلے پر گفتگو ہوئی اور اس موضوع پر مناظرے کا فیصلہ ہوا۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ مولانا صفدر صاحب نے اس فیصلے پر عمل نہ کیا۔ مولانا احمد الدین نے اشتہار شائع کر دیا کہ مولانا صفدر صاحب مناظرے سے گریز کر رہے ہیں۔ اس سے قبل دونوں کا ایک دوسرے سے میل ملاقات کا سلسلہ جاری رہتا تھا، لیکن اشتہار کی اشاعت کے بعد یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

اس اثنا میں مولانا سرفراز صفدر صاحب حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ حج سے واپس آئے تو مولانا احمد الدین ملاقات کے لیے ان کے گھر گئے۔ حج کی مبارک باد دی اور انھیں کھانے پر اپنے گھر بلایا۔ وہ تشریف لائے۔ مولانا احمد الدین نے عزت و تکریم کے ساتھ کھانا کھلایا اور پوچھا کہ آپ نے مجھ سے تعلقات کیوں منقطع کر لیے؟

مولانا سرفراز نے فرمایا: تلك الايام نداولها بين الناس.

بہر حال دونوں کے دل صاف ہو گئے اور میل جول کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔

اب سوال یہ ہے کہ مولانا احمد الدین گکھڑوی نے یہ اشتہار کیوں شائع کیا تھا جس میں لکھا کہ مولانا سرفراز صفدر صاحب نے مناظرے سے گریز کیا؟

اس کی وجہ یہ سننے میں آئی ہے کہ مولانا سرفراز صاحب نے یہ شرط عائد کی تھی کہ میں اس شخص کے ساتھ مناظرہ کروں گا، جس کا تدریس کا تجربہ چالیس سال کا ہو، اور مولانا سرفراز چالیس سال سے فریضۂ تدریس انجام دے رہے تھے، جب کہ مولانا احمد الدین کو اتنے طویل عرصے کی تدریس کے مواقع میسر نہیں آئے تھے، اور مولانا سرفراز صاحب کو اس کا علم تھا۔ مولانا احمد الدین نے اس شرط کو غلط ٹھہرایا اور اسے مولانا سرفراز کا مناظرے سے گریز قرار دیا۔

انھوں نے فرمایا کہ اگر میں یہ کہوں کہ میں اس شخص سے مناظرہ کروں گا، جس کا مناظرے کا تجربہ پچاس سال کا ہو، کیوں کہ میں خود مناظرے کا طویل تجربہ رکھتا ہوں تو یہ شرط بالکل غلط ہوگی۔ سچ اور جھوٹ کے درمیان فرق کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے عمر اور تجربے کی شرط عائد کرنا قرینِ صحت نہیں۔ اس طرح تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ میں اس شخص سے علمی گفتگو کروں گا، جس نے ان اساتذہ سے تعلیم حاصل کی ہو، جن سے میں نے کی ہے، یا کسی مسئلے میں اس سے بحث کروں گا، جس نے میرے جتنی کتابیں پڑھی ہوں یا میرے جتنی کتابیں لکھی ہوں یا جس کی عمر میرے جتنی ہو۔

نندووال ضلع گجرات کا مناظرہ

یہ مناظرہ فروری 1936ء میں ہوا تھا۔ اس کا موضوع نماز میں رفع الدین کرنا تھا۔ احناف کے مناظر مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری تھے اور اہل حدیث کے تھے مولانا احمد الدین گکھڑوی۔

سید عنایت اللہ شاہ صاحب بخاری مرحوم احناف کے دیوبندی مکتبِ فکر کے مشہور عالم تھے۔ انھیں بعض اہل حدیث حضرات بھی اپنے جلسوں میں تشریف آوری کی دعوت دیا کرتے تھے اور وہ ان کے جلسوں میں شرکت فرماتے اور تقریر کرتے تھے۔ مسئلہ توحید پر وہ بڑا موثر وعظ فرماتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ان کے ذہن میں حنفیت نے بھی مضبوطی سے پنجے گاڑ رکھے تھے۔

بہر حال مولانا احمد الدین گکھڑوی کو حضرت شاہ عنایت اللہ صاحب بخاری سے بھی مناظرے کا موقع ملا۔

مناظرے کے بعد لوگوں کی درخواست پر اسی میدان میں مشترکہ طور پر احناف اور اہل حدیث مقرروں کی اصلاحی اور مصالحتی تقریریں ہوئیں، جس کا عوام پر بہت اچھا اثر ہوا۔

گوجراں والا کا ایک اور مناظرہ

گوجراں والا ہمیشہ سے ایک مذہبی شہر کی حیثیت سے مشہور ہے۔ وہاں اہل حدیث اور بریلوی حضرات کے درمیان مختلف اوقات میں کئی مناظرے ہوئے۔ ایک مناظرے کا ذکر گزشتہ سطور میں ہو چکا ہے، جس میں مولانا احمد الدین اور مولانا محمد عمر اچھردی (بریلوی) مناظر تھے۔ مولانا نور حسین اس مناظرے میں مولانا احمد الدین کے معاون اور رفیقِ مناظرہ تھے۔ اس مناظرے کی تاریخ اور موضوع کا علم نہیں ہو سکا۔ یہ مناظرہ گوجراں والا کے بڑے قبرستان سے متصل وسیع میدان میں ہوا تھا۔

اب گوجراں والا کے ایک اور مناظرے کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس کی بھی تاریخ انعقاد کا پتا نہیں چل سکا۔ البتہ موضوع مناظرہ مسئلۂ حاضر و ناظر اور نور و بشر تھا۔ بریلوی حضرات کے مناظر مولانا محمد عمر اچھروی تھے اور اہل حدیث کے مولانا احمد الدین گکھڑوی۔ لیکن اس مناظرے میں صرف نور و بشر کے مسئلے پر بحث ہوئی۔ مولانا احمد الدین گکھڑوی نے قرآن وحدیث اور واقعات کی روشنی میں ثابت کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بشر (انسان) تھے۔ مولانا محمد عمر اچھروی نے کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بشر نہیں تھے، نور تھے۔ دلائل کی رو سے مولانا احمد الدین گکھڑوی کے نقطۂ نظر کو صحیح قرار دیا گیا۔ خود مولانا محمد عمر اچھروی نے تسلیم کیا کہ مولوی احمد الدین زوردار مناظر ہیں۔

اس مناظرے میں مسئلہ حاضر و ناظر پر بحث نہیں ہوئی۔

تقسیم ملک سے قبل کے زمانے میں مناظروں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ کبھی مسلمانوں اور مرزائیوں کے درمیان، کبھی عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان، کبھی آریہ سماجیوں اور مسلمانوں کے درمیان، کبھی سناتن دھرمیوں اور مسلمانوں کے درمیان، کبھی اہل تشیع، اہل حدیث اور احناف کے درمیان اور کبھی ہندوؤں کے فرقوں آریہ سماجیوں اور سناتن دھرمیوں کے درمیان۔ اس اعتبار سے وہ دلچسپ زمانہ تھا۔ لیکن ان مناظروں میں امن وامان کا سلسلہ قائم رہتا تھا۔ کسی موقعے پر کبھی معمولی نوعیت کا جھگڑا تو شاید ہو جاتا ہو، لیکن مار پٹائی تک نوبت نہیں پہنچتی تھی۔ خود مختلف مذاہب کے علماء اور مناظر آپس میں خوش گوار تعلقات رکھتے تھے اور ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔

موضع سکھے ضلع امرتسر

جامع مسجد اہل حدیث فیصل آباد کے خطیب مولانا محمد یوسف انور بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ موضع سکھے (ضلع امرتسر) میں مناظرہ طے پایا۔ اہل حدیث کی طرف سے مناظر مولانا احمد الدین گکھڑوی تھے، لیکن ان کے ساتھ حافظ عبدالقادر روپڑی، ان کے برادر کبیر

حافظ اسماعیل روپڑی اور مولانا عبداللہ ثانی کو بھی تشریف آوری کی دعوت دی گئی تھی۔ بریلوی حضرات کے مناظر مولانا محمد عمر اچھروی تھے، اور ان کے ساتھ چار پانچ دیگر علماے کرام بھی تھے۔ مناظرے کا اشتہار چھپ چکا تھا اور وقت نو بجے کا تھا۔

اس زمانے میں سفر کا زیادہ تر ذریعہ ریل گاڑی تھا۔ مولانا احمد الدین اور ان کے رفقاے کرام اسٹیشن پر پہنچے تو ریل گاڑی نکل چکی تھی۔ دوسری گاڑی کچھ دیر بعد آئی اور یہ حضرات تاخیر سے اپنی منزل پر پہنچے، جب کہ مولانا محمد عمر اچھروی اور ان کے ساتھی، ان سے پہلے وہاں پہنچ چکے تھے۔ دونوں طرف سٹیج لگا ہوا تھا۔ مولانا محمد عمر اچھروی کھڑے ہوئے اور مولانا احمد الدین اور ان کے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ اشتہار پر نو بجے کا وقت لکھا ہے۔ آپ دیر سے آئے ہیں، آپ نے ہمارا وقت ضائع کیا ہے، اس پر معذرت کریں۔ مولانا احمد الدین نے کہا: دکھایئے اشتہار۔ اشتہار دیکھا تو مناظرے کا وقت صرف ''نو بجے'' لکھا تھا۔ یہ نہیں لکھا تھا کہ نو بجے صبح یا نو بجے رات۔ مولانا احمد الدین نے فرمایا: ابھی نو نہیں بجے۔ (یعنی رات کے نو) اس طرح ہم دیر سے نہیں آئے، معذرت کس بات کی کریں۔(1)

اس کے بعد مناظرہ شروع ہوا اور اختتام پر ثالثوں نے مولانا احمد الدین گکھڑوی کی کامیابی کا اعلان کر دیا۔ کسی قسم کا کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔

مناظرۂ لالہ موسیٰ

ایک دوست نے مجھے ایک کتاب عنایت فرمائی ہے جو 33 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا نام ہے ''مناظرۂ لالہ موسیٰ''۔ کتاب بہت سال پہلے صوفی احمد الدین خطیب جامع مسجد اہل حدیث منڈی بہاء الدین (ضلع گجرات) نے شائع کی تھی۔ یہ مناظرہ 13، 14۔ اکتوبر 1934ء کو مولانا احمد الدین گکھڑوی اور مولانا عبدالغفور ہزاروی کے درمیان ہوا تھا۔ مناظرے کے مندرجہ ذیل تین موضوع طے ہوئے تھے۔

(1) یہ واقعہ مولانا محمد یوسف انور نے مولانا احمد الدین سے متعلق ان واقعات میں بھی لکھا ہے جوانھوں نے میرے نام ارسال فرمائے۔ یہ واقعات اس کتاب کے باب نمبر 17 میں ملاحظہ فرمایے۔

1۔ اہل حدیث مناظر مولانا احمد الدین گکھڑوی قرآن وحدیث کی رو سے یہ ثابت کریں گے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غیب کا علم نہیں رکھتے تھے،غیب کی باتیں صرف اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔اس کے برعکس بریلوی مناظر ثابت کریں گے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم غیب جانتے ہیں۔

2۔ اہل حدیث مناظر قرآن وحدیث کی روشنی میں ثابت کریں گے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بشر (انسان) تھے، جب کہ بریلوی مناظر قرآن وحدیث کے دلائل سے ثابت کریں گے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بشر (انسان) نہیں تھے،نور تھے۔

3۔ اہل حدیث مناظر قرآن وحدیث کی رو سے ثابت کریں گے کہ کسی مصیبت کے وقت کسی نبی نے کسی نبی کی قبر پر فریاد نہیں کی،اور بریلوی مناظر قرآن وحدیث کی رو سے ثابت کریں گے کہ فریاد کی ہے۔

اس مناظرے کی روداد کا خلاصہ پنجابی کے ایک شاعر سید امیر نے پنجابی نظم میں بیان کیا ہے،لیکن اس کے بعض حصے اردو میں ہیں۔اس مناظرے میں مسلمان بھی (اہل حدیث اور حنفی) بہت بڑی تعداد میں شامل ہوئے تھے اور سکھ اور ہندو بھی مناظرہ سننے آئے تھے۔وہ چوں کہ متحدہ ہندوستان کا زمانہ تھا اور مسلمان اور غیر مسلمان اکٹھے رہتے تھے،اس لیے دونوں قوموں کے لوگ ایک دوسرے کے بہت سے مذہبی معاملات سے آگاہ تھے اور ان کے باہمی اختلاف کی بحثوں سے دلچسپی رکھتے تھے۔

مناظرۂ لالہ موسیٰ سے متعلق اس کتاب میں دو تعلیم یافتہ سکھوں کی شہادتیں بھی درج ہیں۔ایک سکھ کا نام رویل سنگھ ہے جو موضع دھوریہ ضلع گجرات کے رہنے والے تھے۔وہ اس

مناظرے میں شامل تھے۔انھوں نے اپنے تاثرات گورمکھی زبان میں تحریر کیے تھے۔ساتھ ہی اس کا اردو ترجمہ کیا گیا ہے جو حسب ذیل ہے۔

جو مناظرہ 13، 14 اکتوبر کو لالہ موسیٰ میں زیر جماعت اہل حدیث و بریلوی کے ہوا، اس میں بندہ نے تمام سوالات و جوابات سنے، جس کے بعد میری رائے ہے کہ اس مناظرہ کا تمام حوالہ بذریعہ اخبارات تمام مسلم بھائیوں کی خدمت میں پہنچانا چاہیے، جس کے لیے میری حقیر عرض جناب مولوی غلام علی صاحب سیکرٹری انجمن اہل حدیث لالہ موسیٰ سے ہے۔ جماعت بریلوی کو آخر میں ہار اور جماعت اہل حدیث کو ہر پہلو میں فتح نصیب ہوئی۔سچائی کو ہمیشہ فتح نصیب ہوئی ہے۔

روپل سنگھ سکنہ دھوریہ ضلع گجرات ڈاک خانہ دھوریہ خاص

دوسرے سکھ سردار جودھ سنگھ ہیں۔انھوں نے اپنے تاثرات اردو میں لکھے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔

''جو مناظرہ مورخہ 13، 14۔ماہ اکتوبر 1934ء کو بروز ہفتہ و اتوار بمقام لالہ موسیٰ زیر جماعت اہل حدیث و جماعت بریلوی متصل پرانا تھانہ کیا گیا۔اس مناظرے کو بندہ نے بڑے شوق سے سنا۔اس مناظرے کے متعلق میری رائے ہے کہ اس کا فیصلہ بذریعہ اخبارات ملک کے کونے کونے میں ہر مسلم تک پہنچانا جماعت اہل حدیث لالہ موسیٰ کا فرض اولین ہونا چاہیے۔ان خیالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میری جناب عالی سیکرٹری انجمن اہل حدیث غلام علی صاحب درزی سے نہایت ادباً عرض ہے کہ اس جلسے کا لب لباب تمام مسلمانوں تک بذریعہ اخبارات پہنچانے کی جائز کوشش سے مشکور فرما دیں گے۔ خاص طور پر بریلوی جماعت اور اہل حدیث کا زبردست مقابلہ اور آخر میں جماعت بریلوی کو منہ توڑ شکست ہونا۔

(اردو بعینہٖ) سردار جودھ سنگھ از مقام کوٹلہ قاسم خاں۔
متصل لالہ موسیٰ۔ضلع گجرات۔تحصیل کھاریاں''

اب ایک اور صاحب کے تاثرات سنیے!

''صاحبان جب ہم مناظرہ سن کر موضع چک پنڈی میں واپس آئے تو عشا کی نماز کے بعد چوں کہ تازہ معاملہ تھا، مسجد میں مکالمہ شروع ہو گیا تو دین دار صاحب غلام محمد جو دین دار عاشق پیر کا چچا زاد بھائی ہے، کہنے لگا کہ میری بھی ایک بات سن لینا۔ میں نے کہا اچھا صاحب فرمائیں تو بولا میں کسی کی رعایت وحمایت نہیں کرتا۔ لیکن حق پوشی کو بہت برا سمجھتا ہوں۔

''جب مولوی احمد دین صاحب اپنی ہر ٹرم میں مولوی عبدالغفور صاحب سے بار بار مطالبہ کرتے تھے کہ بتاؤ جب آپ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اب بھی زندہ اور دنیا میں ہر جگہ حاضر وناظر مانتے ہیں تو ان کی موجودگی میں امام صاحب کی تقلید کیوں کرتے ہو؟ جواب میں مولوی عبدالغفور کو ''صم بکم'' دیکھ کر ایک سکھ صاحب نے جو میرے قریب بیٹھا ہوا تھا، اپنے ایک سکھ بھائی سے کہا کہ بریلوی لوگوں کی عقل ماری ہوئی ہے، جب کہ ان کا پیر یا مولوی کہیں باہر سے آتا ہے تو اس کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ اس سے مسئلے پوچھتے ہیں۔ خدمت کرتے ہیں۔ نماز میں آگے کھڑا کر لیتے ہیں۔ اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو آگے کیوں نہیں کھڑا کر لیتے؟ لہٰذا یہ جھوٹے ثابت ہوتے ہیں۔''

مطلب یہ کہ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں اور ہر جگہ حاضر وناظر ہیں تو یہ لوگ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی موجودگی میں کسی دوسرے کو نماز کا امام کیوں بناتے ہیں؟ آپ کے پیچھے نماز کیوں نہیں پڑھتے؟

مناظرے میں شکست کے بعد مولانا عبدالغفور ہزاروی صاحب نے اشتہار شائع کیا تھا کہ مولوی احمد الدین ہار گئے ہیں اور ہم جیت گئے ہیں۔ یہ اشتہار پڑھ کر مولانا احمد الدین نے مولوی عبدالغفور صاحب کو مندرجہ ذیل خط لکھا۔

''مولوی عبدالغفور صاحب مدرس مدرسہ انجمن خدام الصوفیہ گجرات

سنا گیا ہے کہ آپ نے جھوٹی فتح شائع کردی ہے۔ میرے دوست آپ نے انصاف نہیں کیا۔ اگر آپ کے نزدیک یہ صحیح ہے کہ آپ مجھ پر غالب رہے ہیں تو دوبارہ تیار ہوجائیں۔ میں آپ کو ببانگ دہل کہتا ہوں کہ اشتہار لکھ کر مجھے تاریخ فرمادیں۔ بشرطے صحت اسی میدان لالہ موسیٰ میں حاضر ہوجاؤں گا۔ شرائط وہی رہیں گی۔ مسئلہ جو بھی ہو، انکار نہیں۔ علم غیب ہو یا بشر یا حاضر وناظر یا تقلید۔ محض علم منطق پر بولنا ہو تو بڑی خوشی سے، لیکن اس کی ایک پوری ٹرم عربی میں ادا کریں گے۔ مناظرہ دو دن ہوگا۔ جواب جلدی دینا۔ ورنہ آئندہ ایسی لاف زنی سے توبہ کریں۔ ہم آپ کے ضلع ہزارہ میں آپ کے مولد میں بھی یہ چیلنج پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ خیال رہے کہ مناظرہ آپ کو ضرور کرنا پڑے گا۔

فقط:۔ احمد دین"

مولوی عبدالغفور ہزاروی نے مولانا احمدالدین کو اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا۔

یہ قیامِ پاکستان سے پہلے کے چند مناظروں کا تذکرہ تھا۔ ان کے علاوہ انھوں نے اور مناظرے بھی کیے ہوں گے، لیکن ان کی تفصیل کا پتا نہیں چل سکا۔ اب قیامِ پاکستان کے بعد کے چند واقعات ملاحظہ ہوں۔

منڈی روڈ الا روڈ (ضلع فیصل آباد)

جڑاں والا سے دوسرا یا تیسرا ریلوے اسٹیشن منڈی روڈ الا روڈ ہے، جسے سمندری بھی کہا جاتا ہے۔ قیامِ پاکستان سے قبل وہاں اہل حدیث کے چند گھرانے آباد تھے۔ قیامِ پاکستان کے ابتدائی دور میں کچھ مدت وہاں حضرت حافظ عبداللہ روپڑی اور ان کے بھتیجے حافظ عبدالقادر اور حافظ اسماعیل روپڑی سکونت پزیر رہے۔ ان دنوں بریلوی حضرات کے حلقوں میں سانگلہ ہل کے مولانا عنایت اللہ کا بڑا شہرہ تھا۔ انھوں نے اہل حدیث حضرات کو وہاں مناظرے کی دعوت دی جو قبول کرلی گئی۔ مولانا احمدالدین بھی پہنچ گئے۔ اب مولانا عنایت اللہ کی تشریف آوری کا انتظار ہونے لگا۔ اردگرد کے لوگوں کو مناظرے کی اطلاع پہنچ چکی

تھی، اس لیے مناظرہ سننے کے لیے بہت سے لوگ منڈی روڈالا روڈ آئے۔ لیکن مولانا عنایت اللہ نہیں پہنچے۔

مناظرہ تو نہ ہوا لیکن لوگوں نے مولانا احمد الدین کو دیکھنے کی خواہش کی جو وہاں مولانا عنایت اللہ صاحب سے مناظرے کے لیے تشریف لائے تھے۔ سردیوں کا موسم تھا۔ مولانا احمد الدین کمبل اوڑھے بیٹھے تھے جو دو تین جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ ان کی زیارت کے شائقین ان کی سادگی سے نہایت متعجب ہوئے۔

فاروق آباد کا قصہ

ایک مرتبہ فاروق آباد (ضلع شیخوپورہ) میں مولانا عنایت اللہ صاحب کی تقریر کا پروگرام تھا۔ وہ اہل حدیث کے سخت مخالف تھے اور ان کی ہر تقریر اہل حدیث کی مخالفت کے گرد ہی گھومتی تھی۔ فاروق آباد کے اہل حدیث حضرات کو یہ اندیشہ تھا کہ مولوی عنایت اللہ اپنی تقریر میں اہل حدیث کو مناظرے کا چیلنج کریں گے اور فوری طور پر کسی مناظر کا انتظام کرنا مشکل ہوگا۔ اس اندیشے کے پیش نظر انھوں نے پہلے ہی مولانا احمد الدین کو فاروق آباد بلا لیا۔ مولانا عنایت اللہ کو ان کی آمد کا پتا چل گیا تھا۔ انھوں نے حسب عادت تقریر میں اہل حدیث کی مخالفت تو کی، لیکن مناظرے کا چیلنج نہیں کیا۔

ان کی تقریر کے بعد اہل حدیث حضرات کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ مولانا عنایت اللہ صاحب نے اہل حدیث کے متعلق جو کچھ کہا ہے، مولانا احمد الدین گکھڑوی اس کا جواب دیں گے۔ مولانا عنایت اللہ میں جرأت ہے تو ان کی تقریر کا جواب دیں یا جس موضوع پر چاہیں ان سے مناظرہ کریں، لیکن مولانا عنایت اللہ وہاں نہیں ٹھہرے، واپس سانگلہ ہل چلے گئے۔

مولانا احمد الدین گکھڑوی کا خوف

واقعتاً مولانا احمد الدین گکھڑوی کا خوف ان کے بعض مخالف علماء پر طاری رہتا تھا اور

وہ ان کا سامنا کرنے سے گھبراتے تھے۔اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو جو ہمارے مرحوم کرم فرما حکیم عبدالمجید صاحب کے فرزند گرامی حکیم عتیق الرحمٰن صاحب (وزیرآباد) کے حوالے سے بیان کی جاتی ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ

جس زمانے میں مولانا احمدالدین وزیرآباد کی جامع مسجد میں خطبۂ جمعہ ارشاد فرماتے تھے،ان کی مستقل رہائش گکھڑ ہی میں تھی،لیکن جمعرات کو وزیرآباد تشریف لے آتے۔جمعۃ المبارک کے روز یہاں قیام فرماتے اور ہفتے کی صبح کو مسجد میں درس دے کر گکھڑ چلے جاتے۔ایک روز وہ صبح کے درس سے فارغ ہو کر گکھڑ جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ بریلوی مسلک کے مولانا عبدالغفور ہزاروی کے ایک عقیدت مند آئے اور مولانا سے مخاطب ہو کر کہا:

آپ نے کیا فساد مچا رکھا ہے؟

مولانا نے فرمایا: کون سا فساد؟

انھوں نے کہا: یہی بریلویوں کے نقطۂ نظر کی مخالفت کا فساد۔میں چاہتا ہوں،اس کا آج ہی فیصلہ ہو جائے۔اس پر گفتگو کے لیے میں مولانا عبدالغفور ہزاروی کو آپ کے پاس لے کر آتا ہوں۔

مولانا نے فرمایا: مولوی عبدالغفور کو ضرور لایے،میں یہیں مسجد میں بیٹھا ہوں۔اگر وہ یہاں آ جائیں تو ہم اپنی ہار مان لیں گے۔پھر فرمایا: وہ بے شک میرے پاس نہ آئیں،اگر اپنی جگہ سے اٹھ کر چند قدم بھی باہر آ جائیں تو میں پھر بھی اپنی شکست تسلیم کر لوں گا اور ان کی صداقت کا اعلان کر دوں گا۔

یہ سن کر مولانا عبدالغفور ہزاروی کے وہ عقیدت مند بے حد خوش ہوئے اور مولانا عبدالغفور ہزاروی کی خدمت میں پہنچے اور سارا واقعہ انھیں سنایا۔ادھر مولانا احمدالدین نے بھی اعلان کر دیا کہ آج میرے اور مولانا عبدالغفور ہزاروی کے درمیان گفتگو ہو گی۔لیکن

مولانا عبدالغفور ہزاروی نے مولانا احمد الدین گکھڑوی کے پاس جانے اور ان سے گفتگو کرنے سے صاف الفاظ میں انکار کر دیا۔

ان صاحب نے بہت کہا کہ آپ چند منٹ کے لیے مولانا احمد الدین کے پاس چلیے اور بات کیجیے، لیکن وہ نہیں آئے۔

بے شک مولانا احمد الدین گکھڑوی بیسویں صدی کے عظیم مناظر تھے۔ نہایت حاضر جواب مناظر۔ حریف پر شیر کی طرح حملہ کرتے تھے۔ ان کی گفتگو میں بڑی کاٹ تھی۔ ان کے اعتراضات اس قدر تیکھے اور صحیح ہوتے تھے کہ ان کا جواب دینا فریقِ مخالف کے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جاتا تھا۔ ان کا علم ہر وقت تر و تازہ رہتا تھا اور وہ حوالے کی پوری طاقت کے ساتھ حریف پر جھپٹتے تھے۔ وہ کسی مناظرے میں کبھی ناکام نہیں رہے اور کبھی کسی سے دبے نہیں۔ زبان و انداز کی پوری توانائی کے ساتھ بات کرتے تھے۔



ساتواں باب

مرزائیوں کے ساتھ مناظرے

مولانا احمد الدین گکھڑوی نے مناظرے تو شیعہ حضرات سے بھی کیے اور حنفی اہل علم سے بھی، لیکن ان کی اصل پنجہ آزمائی مرزائیوں کے ساتھ رہتی تھی یا عیسائیوں کے ساتھ۔ اس سلسلے میں جو کچھ ہمارے علم میں آیا، وہ ذیل میں درج کیا جارہا ہے۔ مرزائیوں سے مناظروں کی فہرست ملاحظہ ہو۔

1۔ مناظرہ روپڑ

تقسیمِ ملک سے قبل روپڑ کا قصبہ پنجاب کے ضلع انبالہ کی ایک تحصیل تھا۔ تقسیم کے بعد حکومت ہند نے روپڑ کو ضلعے کا درجہ دے کر صوبہ ہریانہ میں شامل کر دیا۔ اس علاقے میں حضرت حافظ عبداللہ روپڑی اور ان کے اصحابِ علم بھتیجوں حافظ محمد اسماعیل روپڑی اور حافظ عبدالقادر روپڑی نے بڑی خدمات سرانجام دیں اور ان کی تبلیغی اور تدریسی مساعی سے وہاں مسلک اہل حدیث کی بے حد اشاعت ہوئی۔ 20، 21 مارچ 1932ء کو وہاں مرزائیوں کے ساتھ مناظرہ ہوا۔ بہت سے علمائے کرام اس مجلس مناظرہ میں شامل تھے۔ لیکن مناظرہ مولانا احمد الدین گکھڑوی نے کیا۔ ان کے مقابلے میں مرزائی مناظر دو تھے ایک ملک عبدالرحمٰن خادم گجراتی اور دوسرے محمد سلیم۔ اللہ تعالیٰ نے مولانا احمد الدین گکھڑوی کو کامیابی عطا فرمائی۔ اس مناظرے کی پوری رپورٹ اس زمانے میں مولوی عبدالمجید سیکرٹری انجمن اشاعتِ اسلام روپڑ (ضلع انبالہ) نے شائع کی تھی۔

2۔ مناظرہ اجنالہ

ضلع امرتسر (موجودہ مشرقی پنجاب) کا ایک مشہور قصبہ اجنالہ ہے۔ آزادیٔ ملک سے پہلے یہ قصبہ امرتسر کی ایک تحصیل تھا۔ اب بھی شاید تحصیل ہی ہوگا۔ وہاں 23۔ جون 1932ء کو اہل حدیث اور مرزائیوں کے درمیان مناظرہ ہوا۔ اہل حدیث کی طرف سے حافظ عبدالقادر روپڑی اور مولانا احمد الدین مناظر تھے۔ مرزائیوں کی طرف سے مناظر تھے احمد علی اور مولوی محمد نذیر۔ اہل حدیث کی طرف سے مناظرہ مولانا احمد الدین گکھڑوی نے کیا تھا۔

3۔ مناظرہ بمبو

ضلع گورداس پور میں ایک گاؤں کا نام "بمبو" ہے۔ وہاں 23۔ جون 1932ء کو مرزائیوں سے مناظرہ ہوا۔ اہل حدیث کی طرف سے دو مناظر تھے، ایک سید عبدالرحیم شاہ مکھوی اور دوسرے مولانا احمد الدین گکھڑوی۔ ان کے مقابلے میں مرزائی مناظر مبارک احمد اور ایک اور شخص تھے۔ سید عبدالرحیم شاہ فیروز پور کی تحصیل موگا کے ایک گاؤں موضع "مکھو" کے رہنے والے تھے۔ اپنے عہد کے مشہور مناظر اور مقرر تھے۔ حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری ان پر بہت اعتماد کرتے تھے اور مختلف مذاہب و مسالک کے مناظرین سے مناظرے کے لیے بسا اوقات انہی کو بھیجتے تھے۔ وہ کافی عرصہ آل انڈیا اہل حدیث کانفرنس کے مبلغ بھی رہے۔ پاکستان کی جماعت اہل حدیث کے مشہور رہنما سید حبیب الرحمٰن شاہ مرحوم قریب کی رشتے داری میں شاہ عبدالرحیم مکھوی کے پوتے تھے۔ حبیب الرحمٰن شاہ 18۔ اپریل 2000ء کو فوت ہوئے۔

بہرحال بمبو میں شاہ عبدالرحیم مکھوی کی موجودگی میں مرزائی مناظر سے مناظرہ مولانا احمد الدین گکھڑوی نے کیا۔ شاہ عبدالرحیم مکھوی نے 1932ء میں وفات پائی۔

4۔ تحصیل اجنالہ کا ایک اور مناظرہ

مولانا محمد حسین شیخوپوری مرحوم کا بیان ہے کہ تحصیل اجنالہ (ضلع امرتسر) کے ایک

گاؤں میں مرزا غلام احمد قادیانی کے صدق و کذب کے موضوع پر مناظرہ ہوا۔ مرزائی مناظر نے یہ ثابت کرنا تھا کہ محمدی بیگم سے نکاح کے بارے میں مرزا صاحب سچے تھے۔ محمدی بیگم سے ان کا نکاح کسی وجہ سے اس دنیائے فانی میں نہیں ہو سکا تو نہ سہی، لیکن بہشت میں ضرور ہوگا جس میں ہمیشہ رہنا ہے۔

اہل حدیث کی طرف سے مولانا احمد الدین گکھڑوی مناظر تھے اور ان کے معاون تھے حافظ عبدالقادر روپڑی۔ گزشتہ صفحات میں بتایا جا چکا ہے کہ حافظ عبدالقادر روپڑی، مولانا احمد الدین گکھڑوی کو استاذ المناظرین کہا کرتے تھے۔

دورانِ مناظرہ میں مولانا احمد الدین گکھڑوی نے محمدی بیگم سے نکاح کے سلسلے میں مرزا صاحب کو جھوٹا ثابت کرتے ہوئے ایک موقعے پر کہا: ''نفخ فی السور'' یعنی مرزا ایک سور (خنزیر) ہے، جس میں جھوٹ ڈالا گیا ہے اور وہ جگہ جگہ نکاح کی جھوٹی بات کرتا رہا ہے۔

مرزائی مناظر شور مچاتا رہا کہ یہ لفظ ''س'' سے نہیں ''ص'' سے ہے اور اس کے معنے یہ ہیں کہ قیامت کو صور پھونکا جائے گا۔ لیکن مولانا احمد الدین کا جادو چل چکا تھا، مرزائی مناظر کی بات کسی نے نہیں سنی۔

مناظروں میں اس قسم کے لطائف کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ 1312ھ (95-1894ء) میں حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے شاگرد رشید مولانا محمد بشیر سہسوانی کا مناظرہ حیات و مماتِ مسیح کے موضوع پر دہلی میں خود مرزا غلام احمد قادیانی سے ہوا۔

مناظرہ تحریری تھا، اس لیے کہ مرزا صاحب تقریری مناظرے پر رضامند نہیں ہوئے تھے۔ جب مولانا محمد بشیر سہسوانی کی گرفت مضبوط ہوئی تو مرزا صاحب گھبرا گئے اور دورانِ مناظرہ میں یہ کہہ کر میدان چھوڑ گئے کہ میرے خسر صاحب تشریف لا رہے ہیں، ان کے استقبال کے لیے میرا دہلی اسٹیشن پر جانا ضروری ہے۔ مولانا محمد بشیر سہسوانی نے ''خسر'' کا

لفظ سنا تو قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی۔

خسر الدنیا و الاخرۃ ذلک ھو الخسران المبین .

(سورہ الحج:11)

(اس نے دنیا اور آخرت دونوں جہان کا نقصان اٹھایا۔ واقعی یہ کھلا نقصان ہے۔)

5۔ چک نمبر 37 جنوبی (ضلع سرگودھا)

28۔ ستمبر 1932ء کو ضلع سرگودھا کے ایک گاؤں چک نمبر 37 جنوبی میں مولانا احمد الدین گکھڑوی اور نذیر احمد قادیانی کے درمیان اجرائے نبوت کے موضوع پر مناظرہ ہوا۔ قادیانی مناظر نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ نبوت کا سلسلہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم نہیں ہوا، بلکہ ہمیشہ جاری رہے گا، جب کہ مولانا احمد الدین نے یہ ثابت کرنا تھا کہ سلسلۂ نبوت نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا۔ مناظرہ ہوا لیکن مولانا احمد الدین کے دلائل کے سامنے مرزائی مناظر نے ہتھیار ڈال دیے۔

6۔ مناظرہ سیالکوٹ

جون 1933ء میں مولانا احمد الدین گکھڑوی کا مناظرہ سیالکوٹ میں قادیانی مناظر ملک عبدالرحمٰن خادم گجراتی اور محمد سلیم سے ہوا۔ سیالکوٹ حضرت مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کا شہر ہے، وہ بھی مناظرے کے اجتماع میں شریک تھے۔ اس میں فتح کا جھنڈا مولانا احمد الدین گکھڑوی کے ہاتھ میں رہا۔

7۔ مناظرہ پونچھ (کشمیر)

مئی 1934ء میں مولانا احمد الدین گکھڑوی کا مناظرہ مرزائی مناظر مولوی محمد حسین سے ہوا۔

تقسیم ملک سے پہلے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں کسی نہ کسی موضوع پر مناظروں کا سلسلہ جاری رہتا تھا اور لوگ بڑے اہتمام سے مجالسِ مناظرہ میں شریک ہوتے اور

نہایت توجہ سے دونوں طرف کے مناظرین کی گفتگو سنتے تھے۔ اس سے اثر پذیر بھی ہوتے۔ بالخصوص مرزائیوں سے بہ کثرت مناظرے ہوتے اور بعض صاف دل لوگ دوران مناظرہ ہی میں مرزائیت ترک کر کے اسلام قبول کر لیتے۔

8۔ مکیانہ ضلع گجرات

28،29۔ اگست 1934ء کو ضلع گجرات کے موضع مکیانہ کے مناظرے میں مولانا احمد الدین گکھڑوی کے مدِ مقابل دو قادیانی مناظر تھے۔ ایک عبداللہ اعجاز اور دوسرے ملک عبدالرحمٰن خادم گجراتی۔ مناظرے کا موضوع تھا مرزا صاحب سے محمدی بیگم کا نکاح۔

یہ موضوع بڑا دلچسپ تھا اس لیے اس نے بڑا طول کھینچا۔

9۔ شملہ

حافظ محمد یوسف گکھڑوی اپنی ایک تحریر میں (جو آئندہ صفحات میں دی گئی ہے) بیان کرتے ہیں کہ مولانا احمد الدین نے مرزائیوں سے شملہ میں مناظرہ کیا تھا۔ یہ شہر اس وقت متحدہ پنجاب میں شامل تھا اور انگریزی حکومتِ ہند کا موسم گرما کا دارالحکومت تھا۔ وائسرے ہند کے دفتر سمیت مرکزی حکومت کے تمام دفاتر دہلی سے شملے منتقل ہو جاتے تھے۔ اس مناظرے میں مولانا ممدوح کی بحث سے متاثر ہو کر 17 مرزائیوں نے مرزائیت سے توبہ کی اور دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کا اعلان کیا تھا۔

یہ بہت بڑی کامیابی تھی جو اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے مولانا احمد الدین کو حاصل ہوئی۔ آزادی کے بعد حکومت ہند نے پنجاب کے تین صوبے بنا دیے تھے۔ ایک صوبہ پنجاب ہی رہا۔ دوسرا صوبہ ہریانہ اور تیسرا ہماچل پردیش بنایا گیا۔ شملہ اور کانگڑا وغیرہ کو ہماچل پردیش میں شامل میں کیا گیا۔

ان مقامات کے علاوہ کراچی، لاہور اور ملک کے مختلف مقامات میں مولانا ممدوح نے قادیانیوں سے مناظرے کیے اور ہر مقام کے ہر مناظرے میں اللہ نے انھیں کامیابی سے نوازا۔

آٹھواں باب

شیعہ حضرات سے مناظرے

مولانا احمد الدین گکھڑوی کے مناظروں کا دائرہ بہت پھیلا ہوا ہے۔ احناف کے بریلوی علمائے کرام اور مرزائی مناظرین سے ان کے مناظروں کی جو روداد ہمیں معلوم ہوئی، خوانندگانِ محترم کو اس سے مطلع کر دیا گیا ہے۔ اب آئندہ سطور میں شیعہ حضرات سے ان کے مناظروں کے بارے میں اپنی معلومات سے آگاہ کیا جاتا ہے۔

1۔ ایک مرتبہ سرگودھا کے ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے مولانا احمد الدین نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے فضائل بیان کیے اور فرمایا کہ ان کا نکاح حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دخترِ نیک اختر حضرت ام کلثوم سے ہوا تھا۔ اس اعتبار سے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے داماد تھے، لیکن شیعہ دوست حضرت علی رضی اللہ عنہ کے داماد کی مخالفت کرتے ہیں، کیوں کرتے ہیں؟

اس پر ہنگامہ بپا ہو گیا اور شیعہ حضرات کی طرف سے ان پر مقدمہ قائم کر دیا گیا۔ صورتِ حال پیچیدہ ہو گئی۔ اس وقت پنجاب کے گورنر مشتاق احمد گورمانی تھے، مولانا سید محمد داؤد غزنوی نے ان سے بات کی تو معاملہ ختم ہوا۔

دراصل بعض مسائل سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے مولانا احمد الدین کے لہجے میں تلخی آ جاتی تھی اور معاملہ دور تک پہنچ جاتا تھا۔ سرگودھا ہی میں اس موضوع پر مولانا محمد صدیق مرحوم نے تقریر کی (جو اس وقت جامع مسجد اہل حدیث فیصل آباد کے خطیب تھے) اس تقریر میں شیعہ حضرات بھی موجود تھے، کسی طرف سے کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔ سب لوگ

اطمینان سے بیٹھے سنتے رہے۔

2۔ ایک مرتبہ علی پور میں مولانا احمد الدین گکھڑوی اور شیعہ عالم مولانا محمد اسماعیل دیوبندی (ساکن گوجرہ) کے درمیان مناظرہ ہوا۔ موضوع یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹیاں کتنی تھیں اور کون کون تھیں۔

شیعہ مناظر مولانا محمد اسماعیل کا (جو دیوبندی کہلاتے تھے) دعویٰ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ہی بیٹی تھیں اور وہ تھیں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا۔

اس کے برعکس مولانا احمد الدین کا موقف یہ تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی چار بیٹیاں تھیں (1) حضرت زینب (2) حضرت ام کلثوم (3) حضرت رقیہ اور (4) حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنھن۔

مولانا احمد الدین نے شیعہ حضرات کی کتابوں سے ثابت کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی چار بیٹیاں تھیں۔

شیعہ مناظر مولانا محمد اسماعیل دیوبندی نے ان حوالوں میں سے بعض کتابوں کے متعلق کہا کہ ان کے حوالے غلط ہیں اور بعض کے متعلق کہا کہ ان کے حوالے صحیح ہیں۔

معاملہ ثالث کے سپرد ہوا تو انھوں نے مولانا احمد الدین کے موقف کو صحیح قرار دیا اور اس طرح فتح ان کے ہاتھ آئی۔

پھر اسی مناظرے میں ''پنج تن پاک'' کا معاملہ زیر بحث آیا۔ شیعہ حضرات کے نزدیک پنج تن پاک ہیں۔ (1) حضرت محمد ﷺ (2) حضرت علی رضی اللہ عنہ (3) حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا (4) حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور (5) حضرت حسین رضی اللہ عنہ۔

شیعہ مناظر مولوی محمد اسماعیل دیوبندی نے انہی پانچ کا ذکر کیا اور پانچ منٹ میں اپنے موقف کی وضاحت کی۔

اس کے بعد مولانا احمد الدین گکھڑوی کی باری آئی تو انھوں نے فرمایا کہ بے شک یہ

پانچ ہستیاں نہایت پاک باز اور انتہائی مقدس ہیں۔ لیکن ان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو کیوں شامل نہیں کیا جاتا؟ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی بیٹی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کیوں شامل نہیں؟ دوسری بیٹی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کیوں شامل نہیں؟ تیسری بیٹی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کیوں شامل نہیں؟ حضرت فاطمہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیٹی اور حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی بہن حضرت ام کلثوم ان مقدس اور پاک باز ہستیوں میں کیوں شامل نہیں؟ ان کو بھی پاک باز اور مقدس ہستیاں مانا جائے۔

مولانا احمد الدین گکھڑوی کا اندازِ بیان اس قدر زوردار تھا کہ سب لوگ اس سے متاثر ہوئے اور پولیس وغیرہ کے وہ سرکاری اہل کار جو امن وامان قائم کرنے اور صورتِ حال کی نگرانی کے لیے مناظرے کے اجتماع میں آئے تھے، ان پر بھی مولانا احمد الدین کے زور بیان کا بے حد اثر ہوا اور انھیں یہ کہنا پڑا کہ مولانا احمد الدین بہت بڑے عالم اور مناظر ہیں۔ اپنے موقف کا اظہار نہایت صاف الفاظ میں کرتے ہیں۔

حافظ عبدالقادر روپڑی (جنھیں سلطان المناظرین کا لقب دیا گیا) کے بقول مولانا احمد الدین گکھڑوی واقعی استاذ المناظرین تھے۔ ان کی حریف پر چڑھائی بڑی زوردار اور گرفت نہایت مضبوط ہوتی تھی۔

انھوں نے شیعیت کے موضوع پر تقریریں تو بہت کی ہوں گی۔ شاید کسی شیعہ اہل علم سے زبانی گفتگو بھی کی ہو، لیکن یہ ہمارے دائرۂ تحریر سے خارج ہے۔ ہم صرف ان کے مناظروں کا ذکر کرنا چاہتے ہیں، مگر معلوم ہوتا ہے کہ شیعہ حضرات سے ان کے مناظرے زیادہ نہیں ہوئے اور یہ ضروری بھی نہیں ہے کہ انھوں نے ہر مسلک کے اصحابِ علم سے ضرور مناظرے کیے ہوں۔

اس باب کے آغاز میں شیعیت کے موضوع پر ان کی سرگودھے کی تقریر کا اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ اس تقریر کی وجہ سے معاملہ کچھ نازک موڑ میں داخل ہو گیا تھا اور اس کو سلجھانے کے لیے بڑی کوشش کرنا پڑی تھی۔

نواں باب

عیسائی پادریوں سے مناظرے اور مباحثے

مولانا احمد الدین گکھڑوی کے مناظرے اور مباحثے عیسائی پادریوں سے بھی ہوتے رہے، اور عیسائیت کے بارے میں ان کا دائرۂ معلومات بہت وسیع تھا۔ اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر انھوں نے کتابیں بھی لکھیں، جن کی تفصیل کتاب کے سولھویں باب (تصانیف) میں آئے گی۔

یہاں یہ عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ برصغیر میں عیسائیوں سے مباحثوں اور مناظروں کا سلسلہ کب شروع ہوا؟

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، اس کا آغاز تیسرے مغل حکمران جلال الدین اکبر کے عہد میں ہوا۔ اس دور کے مشہور مناظرین میں مولانا سعد اللہ خاں، مولانا عبداللہ اور شیخ قطب الدین کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اس کے بعد مناظرات کا یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے زمانے میں اس میں تیزی آگئی تھی، اس لیے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریزوں کی اس وقت تقریباً پورے ملک میں حکومت قائم ہوگئی تھی اور وہ برطانیہ سے عیسائی پادریوں کو بھی اپنے ساتھ لائے تھے تاکہ عیسائیت کی تبلیغ کے ذریعے سے برصغیر کے لوگوں کو حلقہ عیسائیت میں شامل کرنے کی باقاعدہ مہم شروع کی جائے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب اس صورتِ حال سے اچھی طرح باخبر تھے۔ عیسائیوں کا وہ ڈٹ کر مقابلہ کرتے تھے اور بڑے حاضر جواب تھے۔

شاہ صاحب کا عیسائیوں سے پہلا مناظرہ دارالسلطنت دہلی کی جامع مسجد میں ہوا۔

وہ قرآن مجید کا درس دے رہے تھے کہ دورانِ درس ایک پادری نے ان سے کہا کہ میں آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ پہلے اس کا جواب دیجیے۔

شاہ صاحب نے فرمایا: آپ جو سوال کرنا چاہتے ہیں، کیجیے۔

پادری نے کہا: آپ کے پیغمبر (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) زمین میں دفن کیے گئے ہیں اور ہمارے پیغمبر (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کو اللہ تعالیٰ نے آسمان پر جگہ دی، لہٰذا ہمارے پیغمبر کا مرتبہ آپ کے پیغمبر سے بڑا ہے۔

شاہ صاحب نے اس اعتراض اور سوال کے جواب میں جو کچھ فرمایا، اسے فارسی کے ان دو شعروں میں بیان کیا گیا ہے۔

کسے بگفت کہ عیسیٰ زِ مصطفیٰ اعلیٰ است
کہ ایں بہ زیرِ زمیں دفن او بہ اوجِ سما است
بہ گفتمش کہ نہ ایں حجتِ قوی باشد
حباب برسرِ دریا گہر تہہ دریا است(1)

یعنی ایک شخص نے کہا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مرتبہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اونچا ہے، اس لیے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تہہِ زمین مدفون ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان کی بلندیوں پر ہیں۔ میں نے اس کے جواب میں کہا کہ یہ دلیل قوی نہیں ہے، جھاگ ہمیشہ دریا کے اوپر ہوتا ہے اور موتی دریا کی تہہ میں۔

اسی طرح ایک اور پادری نے شاہ عبدالعزیز صاحب سے سوال کیا کہ کیا آپ کے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے محبوب ہیں؟

فرمایا: ہاں۔

وہ بولا: اگر وہ اللہ کے محبوب ہیں تو پھر انھوں نے اپنے نواسے حضرت حسین رضی اللہ

(1) فرنگیوں کا جال ص 137۔

عنہ کے قتل کے وقت اللہ سے فریاد کیوں نہ کی اوران کی جان بچانے کے لیے کیوں نہ کہا؟

حضرت شاہ صاحب نے جواب دیا: ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اللہ سے فریاد کی تھی اوران کی جان بچانے کے لیے عرض کیا تھا۔لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے انھیں جواب ملا کہ تمھارے نواسے کولوگوں نے ظلم سے شہید کیا ہے،لیکن ہمیں اس وقت اپنے بیٹے عیسیٰ کا صلیب پر چڑھنا یاد آرہا ہے۔

عرض یہ کرنا مقصود ہے کہ عیسائی پادریوں سے حضرت شاہ عبدالعزیز کے مکالمات کا سلسلہ چلتا رہا۔شاہ صاحب نے ان لوگوں کو ہمیشہ نہایت مناسب اور مسکت جواب دیے اور اکثر اوقات لطیفے کے اسلوب میں دیے۔

بہر حال ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے ساتھ ہی عیسائی مبلغین اور پادری اپنے مذہب (عیسائیت) کی تبلیغ واشاعت میں مشغول ہو گئے تھے۔ان میں سے کچھ پادری تو وہ تھے جو انگریزوں کی رفاقت میں ان کے ملک (انگلستان) سے یہاں آئے اور کچھ وہ تھے جو ہندوستان ہی کے رہنے والے تھے اور انگریز پادریوں کی تبلیغ سے متاثر ہو کر یا ملازمتوں کے لالچ میں حلقہ بگوشِ عیسائیت ہوئے تھے۔ان دیسی اور ولایتی سب عیسائیوں نے مل کر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف محاذ قائم کر لیا تھا۔علماے دین نے ان لوگوں کا بڑی جرأت اور علمی طاقت کے ساتھ مقابلہ کیا،تحریری صورت میں بھی اور تقریروں اور مناظروں کی صورت میں بھی۔ان حضراتِ علماء میں شاہ عبدالعزیز کے بعد حضرت شاہ محمد اسحاق دہلوی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا سید امیر حسن سہسوانی، حافظ ولی اللہ لاہوری، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور ان کے ہم عصر بہت سے حضرات شامل ہیں۔

پھر اس کے بعد مولانا ثناء اللہ امرتسری، حضرت حافظ محمد گوندلوی، مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی، مولانا احمد الدین گکھڑوی اور ان کے معاصرین کا دور آیا۔انھوں نے بھی بہت سے پادریوں کا مناظرانہ انداز اور تحریر وتصنیف کے اسلوب میں مقابلہ کیا۔مولانا ثناء اللہ

امرتسری نے بالخصوص اس میدان میں انتہائی تگ وتاز کی اور ہر موقعے پر پادریوں کو شکست دی۔ لیکن یہاں مولانا احمد الدین گکھڑوی کی مساعی مناظرانہ کا ذکر کرنا مقصود ہے۔

☆ گوجراں والا کے پرانے لوگ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ گوجراں والا میں پادری عبدالحق نے مناظرے کا چیلنج کیا۔ اس چیلنج کے جواب میں تین حضرات میدان میں اترے، مولانا ثناء اللہ امرتسری، حضرت حافظ محمد گوندلوی اور تیسرے مولانا احمد الدین گکھڑوی جو اس زمانے میں نوجوان تھے۔

☆ ضلع گوجراں والا کے موضع نکا کیلا میں مولانا احمد الدین گکھڑوی اور پادری وساوامل کے درمیان مناظرہ ہوا۔ پادری وساوامل کا موقف یہ تھا کہ حضرت مسیح خدا کے بیٹے تھے، جب کہ مولانا احمد الدین نے یہ ثابت کرنا تھا کہ حضرت مسیح خدا کے بیٹے نہیں تھے۔ خدا تعالیٰ کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ حضرت مسیح بغیر باپ کے پیدا ہوئے اور وہ اللہ کے برگزیدہ پیغمبر تھے۔ مولانا احمد الدین کے دلائل کا پادری صاحب کوئی جواب نہ دے سکے تو عیسائیوں نے یہ بہانہ کر کے جان چھڑائی کہ اس موضوع پر کسی تاریخ کو دوبارہ مناظرہ ہوگا۔ (اخبار ''اہل حدیث'' (امرتسر) 3۔ جون 1927ء)

☆ موضع بوپڑہ (ضلع گوجراں والا) میں ایک مرتبہ تقسیم ملک سے قبل حضرت حافظ محمد گوندلوی اور پادری عبدالحق کے درمیان مناظرہ ہوا۔ مولانا احمد الدین بھی وہیں تھے۔ حضرت حافظ صاحب سے اجازت لے کر انھوں نے بھی پادری عبدالحق سے مناظرہ کیا اور کامیابی حاصل کی۔

☆ ایک مرتبہ ایک پادری صاحب گکھڑ آئے اور رات کو گرجے میں تقریر کرنے لگے۔ تقریر میں انھوں نے اسلام کے بعض احکام پر تنقید کی۔ مولانا احمد الدین نے پادری صاحب کی پوری تقریر سنی۔ دوسرے دن رات کو مولانا نے اپنے مکان کی چھت پر لاؤڈ سپیکر رکھا اور پادری صاحب کی تقریر کا جواب دینا شروع کیا۔ تقریر میں پہلے تو پادری صاحب

کے اعتراضات کا جواب دیا جو انھوں نے اسلام پر کیے تھے، پھر عیسائیت پر تنقید شروع کی۔ اس کی شکایت عیسائیوں نے پولیس سے کی اور مولانا احمد الدین کی گرفتاری کے لیے کہا۔

شکایت کے بعد پولیس آئی اور مولانا کو گرفتار کر کے لے گئی۔ ان کی گرفتاری پر مسلمانوں نے احتجاج کیا تو انھیں چھوڑ دیا گیا۔

اسلام کے سلسلے میں مولانا احمد الدین بے حد غیور تھے۔ اس کے خلاف ان کے لیے چھوٹی سے چھوٹی بات سننا بھی گوارا نہ تھا۔

☆ ہمارے دوست مولانا ابوبکر صدیق (خطیب مسجد اہل حدیث نجم احاطہ تھانے دار لاہور) نے بتایا کہ 1942ء میں وہ کھنڈیلا (راجستھان) میں حضرت مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی کے حلقۂ درس میں شامل تھے، ایک مرتبہ مولانا کھنڈیلوی نے وہاں کی جماعت اہل حدیث کی طرف سے تین روزہ تبلیغی جلسہ منعقد کرایا۔ اس جلسے میں یو پی، بہار اور دہلی کے متعدد علمائے کرام تشریف لائے اور ان کی تقریریں ہوئیں۔ صوبہ پنجاب کے چار علماء کو بلایا گیا تھا، وہ تھے حضرت حافظ عبداللہ روپڑی، ان کے دونوں بھتیجے حافظ اسماعیل روپڑی اور حافظ عبدالقادر روپڑی۔ پنجاب کے چوتھے عالم تھے مولانا احمد الدین گکھڑوی۔ جلسہ بریلوی حضرات کی مسجد کے بالکل سامنے بہت بڑے میدان میں ہوا تھا۔ حافظ اسماعیل روپڑی کی تقریر سے لوگ بہت متاثر ہوئے۔ مولانا احمد الدین گکھڑوی سے جلسے کے مختلف اجلاسوں میں دو تقریریں کرائی گئی تھیں۔ ایک تقریر کا موضوع اتباعِ کتاب وسنت تھا۔ ان کی یہ تقریر بھی بہت زوردار تھی اور حاضرین پر اس کا بڑا اثر ہوا تھا۔ دوسری تقریر کا موضوع اسلام اور عیسائیت تھا۔ یہ موضوع بڑا وسیع تھا، اس میں کفارہ، تثلیث، تحریفِ بائیبل، حفاظتِ قرآن، حضرت مسیح علیہ السلام کا صلیب پر چڑھنا وغیرہ سب باتیں شامل تھیں۔ سامعین میں علاقے کے مشہور پادری اور بہت سے عیسائی بھی موجود تھے۔ مولانا احمد الدین کی اس تقریر سے لوگ بے حد متاثر ہوئے اور انھیں بڑی داد ملی۔ جب وہ اپنے موقف کی

تائید میں مختلف کتابوں کے حوالے دیتے تھے تو ان کے حافظے اور انداز بیان سے سامعین بڑے حیران ہوتے تھے۔

☆ مولانا احمد الدین ابھی تعلیم سے فارغ ہوئے تھے کہ پادری عبدالحق گکھڑ آیا۔ وہ علم منطق کا ماہر تھا اور مناظرے میں حریف کو منطقی سوالات میں الجھانے کی کوشش کرتا تھا۔ گکھڑ میں اس نے تقریر کی جس میں اسلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اطہر پر اپنی عادت کے مطابق شدید حملے کیے۔ مولانا احمد الدین اس وقت مروجہ تعلیم تو حاصل کر چکے تھے، لیکن نوعمر تھے۔ وہاں کے لوگوں کے کہنے پر انھوں نے عبدالحق پادری کی تقریر کا جواب دینے کا فیصلہ کیا۔ بائیبل کا کچھ حصہ پڑھا اور اللہ کا نام لے کر تقریر شروع کر دی۔ پھر پادری عبدالحق سے مناظرہ کیا اور فتح یاب ہوئے۔ موضوع مناظرہ یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام، خدا تعالیٰ کے بیٹے ہیں یا نہیں؟ پادری عبدالحق کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ خدا کے بیٹے ہیں، جب کہ مولانا احمد الدین نے یہ ثابت کرنا تھا کہ اللہ کی کوئی اولاد نہیں ہے۔ مناظرے کا نتیجہ مولانا احمد الدین کی کامیابی کی صورت میں نکلا، اور کئی عیسائی اور سکھ دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ ان کا چھوٹی عمر کا یہ بہت کامیاب مناظرہ تھا۔

☆ گوجرانوالا میں ایک مرتبہ بریلوی حضرات اور عیسائیوں کے درمیان مناظرہ طے پایا۔ اب مناظرے کے لیے بریلوی حضرات کے چند سرکردہ لوگ مولانا محمد عمر اچھروی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا محمد عمر نے معذرت کر لی اور فرمایا کہ میں نے کبھی عیسائیوں سے مناظرہ نہیں کیا۔ تم مولانا احمد الدین کے پاس جاؤ۔ یہ تقسیم ملک سے بعد کا واقعہ ہے۔ مولانا احمد الدین اس وقت لائل پور کے علاقہ مومن آباد کی مسجد اہل حدیث میں فریضہ خطابت سرانجام دیتے تھے اور وہیں اقامت گزین تھے۔ وہ لوگ بادل نخواستہ مولانا احمد الدین کی خدمت میں آئے۔ مولانا نے ان کی بات سنی اور مناظرے کے لیے تیار ہو گئے۔ پادری صاحب وہاں پہلے سے موجود تھے۔ انھیں مولانا احمد الدین کی آمد کا پتا چلا تو

کہا: میرا اعلان بریلوی عالم سے مناظرہ کرنے کا ہے، مولانا احمد الدین سے میں مناظرہ نہیں کرنا چاہتا۔

بغیر مناظرہ کیے مولانا احمد الدین کو کامیابی حاصل ہوگئی اور کتنے ہی لوگوں نے مسلک اہل حدیث اختیار کرلیا۔

☆ ایک مرتبہ سانگلہ ہل کے بریلوی حضرات نے ایک پادری صاحب سے مناظرے کا فیصلہ کیا اور تاریخ مقرر کرلی گئی۔ اب وہ اپنے مسلک کے مشہور عالم مولانا سردار احمد صاحب کی خدمت میں لائل پور آئے اور ان سے پادری صاحب کے ساتھ مناظرے کے لیے عرض کیا۔ مولانا سردار احمد کو کبھی کسی پادری سے بحث ومناظرے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس زمانے میں مولانا احمد الدین گکھڑوی فیصل آباد کے علاقے مومن آباد کی مسجد اہل حدیث میں خدمت خطابت انجام دیتے تھے۔ مولانا سردار احمد نے سانگلہ ہل کے لوگوں کو مولانا احمد الدین کے پاس بھیج دیا۔ مولانا احمد الدین کا رہن سہن بالکل سادہ تھا۔ وہ لوگ انھیں دیکھ کر بڑے متعجب ہوئے۔ ان سے مناظرے کے متعلق کہا اور مولانا سردار احمد کے بارے میں بتایا کہ انھوں نے ہمیں آپ کی طرف بھیجا ہے۔ پہلے تو مولانا نے مزاحاً فرمایا کہ حلوہ کھانے کے لیے سردار احمد اور ان کے ساتھی، ڈنڈے کھانے کے لیے وہابی۔ اس کے بعد مولانا احمد الدین چند اہل حدیث حضرات کی رفاقت میں سانگلہ ہل پہنچے۔ ان کا نام سنتے ہی پادری صاحب غائب ہوگئے۔ مناظرہ تو نہ ہوا لیکن تین دن مولانا احمد الدین بریلوی حضرات کی مسجد میں مقیم رہے اور عیسائیت سے متعلق مختلف موضوعات پر ان کی تقریروں کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کا نتیجہ مناظرے سے بھی اچھا نکلا۔ پادری صاحب تو مناظرے سے ہٹ ہی گئے تھے، لیکن بریلوی حضرات پر اس کا بہت اچھا اثر پڑا اور انھیں اہل حدیث مسلک سے واقفیت ہوئی۔ بریلوی حضرات اور اہل حدیث ایک دوسرے کے قریب ہوئے۔

☆ ایک دفعہ ساہی وال میں ایک پادری صاحب نے مسلمانوں کو مناظرے کا چیلنج کیا تو وہاں کی ایک مسجد اہل حدیث کے خطیب حافظ عبدالحق صدیقی مرحوم نے مولانا احمد الدین کے پاس آدمی بھیجا۔ مولانا تشریف لائے تو پادری صاحب نے جواب دیا کہ اس نے جامعہ رشیدیہ کے دیوبندی علماء کو مناظرے کے لیے چیلنج کیا ہے، مولانا احمد الدین سے میرا کوئی جھگڑا نہیں اور میں ان سے کسی بھی موضوع پر مناظرہ نہیں کرنا چاہتا۔ تاہم مولانا احمد الدین نے وہاں عیسائیت سے متعلق تقریریں کیں۔ پادری صاحب کو بار بار مناظرے کی دعوت دی، لیکن وہ مقابلے میں نہیں آئے۔ اس طرح مناظرے کے بغیر ہی مولانا احمد الدین اپنے نیک مقصد میں کامیاب رہے۔

☆ بعض اوقات مناظر کو ایسی باتیں بھی مناظرے میں کہنا پڑتی ہیں جو عام حالات میں نہ وہ کہہ سکتا ہے، نہ کہنا چاہتا ہے۔ لیکن مدِ مقابل مجبور کرتا ہے تو بادلِ نخواستہ جواب دینے کے لیے اسے زبان کھولنا پڑتی ہے۔ ایک مرتبہ لاہور میں حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری ایک آریہ پنڈت سے مناظرہ کر رہے تھے۔ پنڈت جی نے اسلامی احکام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بعض نہایت نازیبا کلمات کہے۔ مولانا ثناء اللہ صاحب نے اپنے خاص انداز میں ان کا جواب دیا تو وہ مزید گستاخی پر اتر آیا۔ اب جواب میں مولانا کچھ دوسرا انداز اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ پنڈت جی مجھے جواب کے لیے جبراً ایسی راہ پر لگانا چاہتے ہیں، جس سے میں بچنا چاہتا تھا۔ اب میں انھی کی مذہبی کتابوں سے ان کے اعتراضات کا جواب دوں گا۔ دیویوں سے میری گزارش ہے کہ وہ اس مجلس سے تشریف لے جائیں۔ میں نہیں چاہتا کہ ان قابلِ احترام دیویوں کے سامنے ان کی مذہبی کتابوں کی اصل عبارتیں پڑھوں۔ پھر ایک منٹ مولانا خاموش رہے۔ ایک منٹ کے بعد فرمایا: امید ہے دیویاں تشریف لے گئی ہوں گی۔ اب میں وہ عبارتیں پڑھتا ہوں جو دیویوں کی موجودگی میں نہیں پڑھنا چاہتا تھا۔ ابھی مولانا نے دو مقامات ہی سے چند الفاظ

پڑھے تھے کہ پنڈت جی نے ہاتھ جوڑ دیے اور کہا بس کیجیے، اس سے آگے نہ پڑھیے۔

☆ اسی طرح کا معاملہ ایک دفعہ مولانا احمد الدین کے ساتھ پیش آیا۔ مناظرے میں ایک بدزبان پادری نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ازواج مطہرات کے متعلق کہا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طاقت کو نو سال کی (حضرت) عائشہ (رضی اللہ عنہا) نے کیسے برداشت کیا؟

مولانا احمد الدین کو بادلِ نخواستہ جواب دینا پڑا کہ تم لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہو، اس طرح حضرت مریم علیہا السلام جو حضرت عیسیٰ کی والدہ تھیں۔ (العیاذ باللہ) اللہ کی بیوی ہوئیں۔ انھوں نے اللہ کی لامحدود طاقت کو کیسے برداشت کیا؟

اس جواب پر لوگ بہت خوش ہوئے اور مولانا احمد الدین کو بے حد داد بھی ملی۔ لیکن انھوں نے فرمایا: میں نے پادری صاحب کی بدزبانی اور انتہائی گستاخانہ الفاظ سے مجبور ہو کر یہ جواب دیا ہے۔ اس پر میں اللہ سے توبہ کرتا ہوں۔ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ابنیت وابویت کے سلسلے سے پاک ہے...... لم یلد ولم یولد...... حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے پیغمبر تھے۔ ان کا کوئی باپ نہ تھا۔ ان کی ماں حضرت مریم بہ درجہ غایت پاک باز عورت تھیں۔

یہ واقعہ میں نے اس لیے بیان کیا ہے کہ مناظر کو بسا اوقات کئی قسم کی مشکل منزلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

☆☆☆

دسواں باب

حضرت مولانا حافظ عبدالستار دہلوی سے مناظرہ

اب ایک اور مناظرے کی مختصر سی روداد ملاحظہ ہو۔ میں اس مناظرے میں شامل تھا۔
یہ مناظرہ اس وقت کی جماعتِ غربائے اہل حدیث کے امام حضرت مولانا حافظ عبدالستار دہلوی مرحوم و مغفور سے ہوا تھا۔ (1)

مجھے اس مناظرے کی تفصیل کا علم ہے اور جن مسائل میں یہ حضرات اختلاف کرتے تھے، اس کے بھی میں تمام پہلوؤں سے باخبر ہوں، لیکن اس کا تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔
مناظرہ کیوں ہوا تھا اور اس کا پس منظر کیا تھا؟

چند الفاظ میں سنیے!

1928ء کے لگ بھگ حضرت مولانا محمد علی لکھوی مرحوم نے اپنے آبائی مسکن "لکھو کے" سے ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر پینتالیس ایکڑ زمین میں "مرکز الاسلام" کے نام سے ایک تدریسی ادارہ قائم کیا تھا۔ انھوں نے سکونت بھی یہیں اختیار کر لی تھی۔

آبادی سے کچھ دور یہ ایک جنگل تھا۔ 1937ء میں مولانا محمد علی لکھوی نے تدریس کے لیے مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کی خدمات حاصل کیں تو میں بھی طالب علم کے طور پر مولانا عطاء اللہ صاحب کے ساتھ وہیں چلا گیا۔ طلبا کی جماعت میں مولانا محمد علی لکھوی کے دونوں صاحب زادے (مولانا محی الدین لکھوی اور مولانا معین الدین لکھوی) بھی شامل تھے۔

(1) اپنی جماعت کے مرکزی سربراہ کو یہ حضرات "امام" کہتے ہیں لیکن صوبائی اور ضلعی سربراہ کے لیے اخباروں میں "امیر" کا لفظ مرقوم ہوتا ہے۔

مرکز الاسلام سے ڈیڑھ میل کے فاصلے پر ایک گاؤں ''چک مولوی والا'' تھا۔ اس گاؤں میں ایک بزرگ میاں عبدالقادر سکونت پذیر تھے جو ایک سرکاری سکول میں معلم تھے۔ نہایت حلیم الطبع بزرگ۔ گرمیوں کا موسم تھا کہ اپنے چند معزز رفقاء کی معیت میں جماعتِ غربائے اہل حدیث کے امام حضرت مولانا حافظ عبدالستار دہلوی تشریف لائے اور چک مولوی والا میں میاں عبدالقادر مرحوم کے ہاں قیام فرما ہوئے۔

حضرت حافظ عبدالستار مشہور مبلغ توحید اور بہت اچھے خطیب تھے۔ انھوں نے وہاں کے دیہات میں تبلیغی دورہ شروع کیا اور بعض مسائل میں مولانا محمد علی لکھوی کو مناظرے کا چیلنج کیا۔ یہ معلوم نہیں کہ اس چیلنج کو تبلیغ دین سے کیا تعلق تھا۔ لوگ مولانا کی خدمت میں آئے اور حضرت حافظ صاحب کی سرگرمیوں اور مناظرے کے چیلنج کی بات کی۔ مولانا نے اس وقت اسے کوئی خاص اہمیت نہ دی اور فرمایا مناظرے کے لیے محی الدین کو لے جاؤ۔ (مولانا محی الدین لکھوی، مولانا محمد علی صاحب کے بڑے صاحب زادے تھے، جو 27۔ فروری 1998ء کو فوت ہوئے۔)

مولانا محمد علی صاحب نے حافظ صاحب اور ان کی جماعت کے متعلق کبھی ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ جماعت اہل حدیث کے علماء کو آپس میں جھگڑنا نہیں چاہیے۔ لیکن حضرت حافظ صاحب نے مختلف دیہات میں جا کر مناظرے کے لیے بہت زیادہ اصرار کیا، بلکہ اسی کو تبلیغ دین قرار دے لیا، جس سے اس نواح کے لوگ پریشان ہوئے۔ ایک گاؤں ڈھنڈیاں میں انھوں نے جلسہ کرنے کا اعلان بھی کر دیا۔ اب مجبور ہو کر مولانا محمد علی صاحب نے مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی سے فرمایا کہ وہ کسی مناظرے سے بات کریں جو یہاں آئیں اور حافظ صاحب سے ان مسائل کے متعلق مناظرہ کریں جن پر وہ مناظرہ کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ مولانا عطاء اللہ صاحب گکھڑ گئے اور مولانا احمد الدین سے بات کی۔

مولانا عطاء اللہ صاحب نے بتایا تھا کہ جب وہ مولانا احمد الدین کے پاس گکھڑ پہنچے، اس وقت وہ کسی کام میں مصروف تھے اور وہ اس کام کو جلد ختم کرنا چاہتے تھے۔

مولانا احمد الدین نے ان سے کہا مجھے تو معلوم ہی نہیں کہ غربائے اہل حدیث کون ہیں اور کن مسائل میں ان کا کیا نقطۂ نظر ہے اور عام اہل حدیث حضرات سے ان کے اختلاف کی کیا نوعیت ہے۔

مولانا عطاء اللہ صاحب نے ان سے فرمایا کہ آپ میرے ساتھ چلیے۔ میں اس سلسلے کی تمام باتیں آپ کو راستے میں بتا دوں گا۔ چنانچہ وہ مولانا عطاء اللہ حنیف صاحب کے ساتھ چل پڑے اور مولانا نے اثنائے سفر میں ان کو ضروری باتیں بتا دیں۔

مولانا احمد الدین نہایت ذہین تھے اور مسائل دینیہ کے تمام گوشوں پر انھیں عبور حاصل تھا۔ مولانا عطاء اللہ صاحب کے بتانے اور چند کتابوں کے حوالے دینے سے اصل موضوع کے سب نکات ان کے ذہن میں آ گئے۔

لکھو کے سے کچھ فاصلے پر نہر کے کنارے موضع ''ڈھنڈیاں'' میں مناظرہ طے پایا۔ مناظرے سے پہلے علیحدگی میں حضرت حافظ عبدالستار صاحب سے ان کی کچھ باتیں بھی ہوئیں۔ بہت بڑا مجمع تھا۔ مولانا محمد علی لکھوی بھی موجود تھے جو مولانا احمد الدین کے قریب کرسی پر بیٹھے تھے۔ میں بھی وہیں زمین پر بیٹھا تھا۔ فاضلکا بنگلہ اور اس کے ارد گرد کے دیہات میں اوڈ راجپوت خاصی تعداد میں آباد تھے اور وہ جماعتِ غربائے اہل حدیث سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے سربراہ مولانا عبداللہ اوڈ تھے جو چودھری قسم کے آدمی تھے اور صوبہ پنجاب کی جماعت غربائے اہل حدیث کے منصبِ امارت پر فائز تھے، وہ بھی مجلسِ مناظرہ میں تشریف فرما تھے۔ لڑائی جھگڑے کے خطرے کے پیش نظر پولیس کے چند آدمی بھی موجود تھے۔

مناظرہ شروع ہوا۔ مولانا احمد الدین گکھڑوی کے مقابلے میں خود حضرت حافظ عبدالستار صاحب امام غربائے اہل حدیث مناظر تھے۔ اوڈوں کی وجہ سے فضا بڑی گرم تھی۔

مولانا احمد الدین گکھڑوی نے اپنے موقف کے حق میں دلائل دینا شروع کیے تو تیسری باری میں حضرت حافظ صاحب کی آواز کا جلال نرم پڑ گیا اور مناظرے کا پانسا پلٹنے لگا۔ پھر صورتِ حال نے ایسا رخ اختیار کر لیا جو محترم المقام حضرت امام صاحب کی عقیدت مند اوڈ برادری کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ چنانچہ مولانا عبداللہ اوڈ کے اشارے سے اوڈوں نے (جو اسی کام کے لیے لائے گئے تھے) ایک دم ہنگامہ بپا کر دیا اور لمحہ بھر میں ان کی لاٹھیاں فضا میں لہرانے لگیں۔ پھر لوگ یہ کہتے ہوئے منتشر ہو گئے کہ دلی کے اردو بولنے والے عالم کے لیے پنجاب کے مولوی احمد الدین کے ''وارے آنا بہت اوکھا'' کام ہے۔ انھوں نے مناظرے سے بچنے کے لیے اوڈوں کو پکارا اور اپنی ہار کو لڑائی میں بدل دیا۔

سب کچھ جاننے کے باوجود میں جماعت غربائے اہل حدیث کے سلسلے میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ صرف یہی عرض کروں گا کہ تقسیم ملک سے قبل بعض فروعی مسائل کی تعبیر میں ان حضرات میں سختی کا عنصر غالب تھا۔ لیکن اس کے بعد حالات بدل گئے۔ اس جماعت کا مرکزی دفتر کراچی ہے اور ان کا پندرہ روزہ جریدہ ''صحیفہ اہل حدیث'' بھی وہیں سے شائع ہوتا ہے۔ اپنے انداز کا یہ بہت اچھا جریدہ ہے جو صاف زبان میں قاری کو بہترین مواد دیتا ہے۔ طویل مدت سے میں اس کا مستقل قاری ہوں اور اس کے مندرجات پڑھ کر خوش ہوتا ہوں اور ان سے استفادہ کرتا ہوں۔

ان کے اہل علم نے قرآن وحدیث کی بے حد خدمت کی۔ مولانا حافظ عبدالستار مرحوم ومغفور نے قرآن کی تفسیر لکھی، جو علمی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اور بھی متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ کراچی میں دارالعلوم جاری کیا، جس میں بے شمار علما وطلبا نے تعلیم حاصل کی اور کر رہے ہیں۔ اس جماعت کے ایک رکن مولانا امام الدین جونیجو نے قرآن مجید کے اردو ترجمے کا سندھی زبان میں ترجمہ کیا۔ انھوں نے اور بھی کئی اہم اردو کتابوں کو سندھی میں منتقل کیا۔ امام صاحب کے خاندان کے بعض علمائے عظام نے حدیث کی بعض کتابوں کا

اردو زبان میں ترجمہ کیا اور بہت عمدگی سے کیا، جس سے لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔ مستفید ہونے والوں میں خود میں بھی شامل ہوں۔

میں پہلا شخص ہوں جس نے کئی سال پہلے اپنی کتاب ''کاروانِ سلف'' میں حضرت مولانا عبدالوہاب دہلوی اور مولانا حافظ عبدالستار دہلوی پر مفصل مضامین لکھے۔ یہ کتاب مکتبہ اسلامیہ فیصل آباد اور لاہور نے شائع کی۔ اب تک اس کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ پھر ان میں سے بعض حضرات کا تذکرہ میں نے ایک اور کتاب ''برصغیر کے اہل حدیث خدام قرآن'' میں کیا۔ ''گلستانِ حدیث'' میں بھی اس خانوادے کے بعض اہل علم کی خدمات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ان حضرات کی خدمتِ دین کا سلسلہ حالات کے مطابق ہندوستان میں بھی جاری ہے اور پاکستان میں بھی۔ جہاں تک میں جانتا ہوں پاکستان میں ان کی تدریسی اور تصنیفی تگ ودو کا دائرہ بہت پھیلا ہوا ہے۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کے مرحومین کو جنت الفردوس عطا فرمائے اور موجودین کو خدمتِ دین کی زیادہ سے زیادہ توفیق سے نوازے۔ آمین۔

حضرت حافظ عبدالستار دہلوی نے صرف 61 برس عمر پائی اور 29۔ اگست 1966ء کو سفر آخرت اختیار کیا۔

کاروانِ سلف میں اس فقیر نے مولانا عبداللہ اوڈ کے واقعاتِ زندگی بھی خاصی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ انھوں نے پہلے منڈی صادق گنج (ضلع بہاول نگر) کے اس مدرسے میں تحصیل علم کی جو وہاں علماے غزنویہ نے جاری کیا تھا۔ پھر امرتسر کے مدرسہ غزنویہ میں مولانا عبدالغفور غزنوی، مولانا نیک محمد اور دیگر حضرات سے کسب فیض کیا۔ بعدازاں دہلی جا کر مولانا عبدالوہاب کے مدرسہ دارالکتاب والسنہ میں داخلہ لیا اور مولانا مرحوم سے سندِ فراغت لی۔ وہ پنجاب کی اوڈ برادری کے سربراہ تھے۔ جماعت غربائے اہل حدیث (پنجاب) کے بھی امیر تھے۔ ان کا مسکن فاضلکا بنگلہ (ضلع فیروز پور) تھا۔ وہاں اوڈ

راجپوت کافی تعداد میں آباد تھے۔ مولانا عبداللہ اوڈ نے اوڈوں سے اس اجتماع پر حملہ کرایا تھا، جس میں مولانا حافظ عبدالستار دہلوی اور مولانا احمد الدین گکھڑوی مناظرہ کر رہے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ پنجاب میں حضرت حافظ صاحب کا مناظرہ ناکام ہو۔ اس سے ان کی اہانت کا پہلو نکلتا تھا۔ پھر اس ناتمام مناظرے کی کارروائی ان حضرات نے اپنے اخبار ''صحیفہ اہل حدیث'' (دہلی) میں کس انداز میں شائع کی، اس کا مجھے علم نہیں۔ لیکن یہ معلوم ہے کہ اس مناظرے کے بعد حضرت حافظ صاحب نے ان دیہات میں تبلیغی دورے کا سلسلہ ختم کر دیا تھا اور وہ واپس دہلی تشریف لے گئے تھے۔

مولانا عبداللہ اوڈ میرے مہربان تھے۔ قیامِ پاکستان سے قبل بھی میرے ان سے مراسم تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد وہ اپنے کسی کام کے سلسلے میں لاہور آتے تو ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے دفتر بھی تشریف لاتے اور اس فقیر کا سلام قبول فرماتے۔

انھوں نے 28۔ اکتوبر 1966ء کو چک نمبر 20 ایم بی (ضلع سرگودھا) میں وفات پائی۔

یہ مناظرہ آج سے 73 برس پہلے 1937ء میں ہوا تھا۔ میرا خیال ہے کہ دو آدمیوں کے سوا اب کوئی شخص ایسا نہیں ہوگا، جس نے یہ مناظرہ دیکھا ہو جو مولانا حافظ عبدالستار دہلوی اور مولانا احمد الدین گکھڑوی کے درمیان ہوا تھا، وہ دو آدمی ہیں مولانا معین الدین لکھوی اور یہ فقیر۔! مولانا معین الدین لکھوی بیمار ہیں اور یہ فقیر اللہ کی مہربانی سے تندرست ہے اور مناظرے کے تمام واقعات کا عینی شاہد۔!!

مناظرے کی یہ روداد جو میں نے بیان کی ہے آج سے 73 برس قبل کی ہے۔ میری عمر اس وقت دس گیارہ برس کی تھی۔ مولانا عارف جاوید محمدی صاحب نے اواخر جنوری 2011ء کو مجھے کویت سے حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری کے اخبار ہفت روزہ ''اہل حدیث'' (امرتسر) کے 20۔ اگست 1937ء کے شمارے کے ایک مضمون کی فوٹو کاپی بھیجی

ہے۔ یہ مضمون اخبار ''اہل حدیث'' کے صفحہ 6 کے دو کالموں میں شائع ہوا ہے جو استاذِ پنجاب حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی رحمۃ اللہ علیہ کا تحریر فرمودہ ہے۔ حضرت مولانا لکھوی مشہور معلم اور نہایت متقی بزرگ تھے۔ ان سے ہزاروں طلبا نے اکتسابِ فیض کیا اور علم وعمل کے اونچے مرتبے پر فائز ہوئے۔ جماعت غربائے اہل حدیث کے علمائے کرام صدارت یا امارت کے بجائے امامت کے قائل ہیں، یعنی اپنے سربراہ کو ''امام'' کے لفظ سے پکارتے ہیں، اس لیے دورِ گزشتہ میں عام لوگ انھیں ''امامیہ'' کہا کرتے تھے اور ان کی طرف ''امامیہ'' کی نسبت غلط نہیں ہے۔ حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اس مختصر مضمون کا عنوان ''جماعت امامیہ دہلی اور اہل حدیث کا مناظرہ'' قائم کر کے اس جلسے کی روداد بیان فرمائی ہے۔ انھوں نے اسی وقت یہ واقعہ رقم فرما دیا تھا اور میں 73 سال بعد لکھ رہا ہوں۔ مجھے حضرت مولانا کی تحریر کا کوئی علم نہ تھا۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود میرے حافظے نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا اور میری گزارشات حضرت مولانا لکھوی کے ارشادات سے ملتی جلتی ہیں۔ حضرت مولانا نے 26۔ فروری 1952ء (7۔ ربیع الاول 1372ھ) کو جامعہ محمدیہ اوکاڑہ میں وفات پائی اور چک نمبر 18 ون ایل تحصیل رینالہ خورد (ضلع اوکاڑہ) میں دفن کیے گئے۔

فیصل آباد سے تعلق رکھنے والے ہمارے دوست محمد رمضان سلفی صاحب جو جماعت غربائے اہل حدیث سے وابستہ ہیں (یعنی امامیہ ہیں) وہ حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کے ان ارشادات کو ''تبرک'' سے تعبیر کرتے ہیں اور واقعی یہ بہت بڑا تبرک ہے۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی سرگرمیوں کا مرکز ہمیشہ تدریس رہا۔ مضمون نگاری یا تصنیف وتالیف سے انھیں لگاؤ نہ تھا۔

یہ ان کی پہلی مطبوعہ تحریر ہے جو میرے دوست مولانا عارف جاوید محمدی کی وساطت سے اس فقیر کے علم میں آئی۔ اس پر میں اپنے اس معزز دوست کا بے حد شکر گزار ہوں۔

اب ذیل میں حضرت مولانا لکھوی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادات (بہ صورت تبرک) ملاحظہ فرمایے۔

''جماعت امامیہ نے موضع ڈھنڈیاں، ضلع فیروز پور پنجاب میں تبلیغی جلسہ کرنے کا اعلان کیا اور ساتھ ہی جماعت اہل حدیث کو مناظرے کا چیلنج بھی دیا۔ اعیانِ اہل حدیث دل سے اس مناظرے کے متمنی تھے، اس لیے انھوں نے بڑی خوشی سے اس چیلنج کو قبول کیا۔ مقامی علما کے علاوہ مولوی عبدالعزیز صاحب ملتانی اور مولوی احمد الدین گکھڑوی بھی اس مناظرے میں شریک ہوئے۔ اہل حدیث کی طرف سے مناظر مولوی احمد الدین صاحب مقرر ہوئے اور امامیوں کی طرف سے حافظ عبدالستار صاحب (امامِ جماعت) خود مناظر بنے۔

''اہل حدیث مناظر نے حسب قاعدہ علم مناظرہ حافظ صاحب سے درخواست کی کہ اپنا دعویٰ بیان کریں یعنی دوسرے الفاظ میں یوں کہا کہ آپ اپنی امامت کی نوعیت بیان کریں تاکہ ہم غور کرسکیں کہ آپ کا دعویٰ امامت کہاں تک صحیح ہے۔ اس کے جواب میں حافظ صاحب نے کہا کہ آپ اعتراض کریں تو ہم جواب دیں گے۔ آخر بہت سی قیل وقال کے بعد اہل حدیث مناظر نے کہا کہ آپ اپنے خطبہ صدارت جلسہ منعقدہ دہلی میں لکھتے ہیں کہ میری امامت ماننے کے بغیر نجات نہیں ہوسکتی۔ (1)

''ایسا دعویٰ تو امامتِ نبوت کا مدعی کیا کرتا ہے۔ دوسرے درجے پر امامت بمعنی حکومت ہے۔ اس کے لیے امام میں سیاسی اقتدار کا ہونا شرط ہے یعنی امام میں اتنی قدرت ہو کہ وہ مجرموں کو شرعی سزائیں دے سکے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ اس وصف سے خالی ہیں، پھر آپ کا ایسا دعویٰ کیوں کر صحیح ہوسکتا ہے۔

''حافظ صاحب نے جواب میں کہا کہ ہمارا دعویٰ دوسری قسم کی امامت کا ہے۔ مگر ابتدا میں

---

(1) یہ ساری عبارت اصل الفاظ میں ''اہل حدیث'' مورخہ 9۔ جولائی 1937ء میں صفحہ 6 پر درج ہے۔ (اہل حدیث)

سیاست لازم نہیں ہوا کرتی۔ اس کے علاوہ آپ نے مسئلہ امامت کے اثبات میں بہت سی حدیثیں پڑھیں، جن میں محض اس بات کا ذکر ہے کہ مسلمانوں کے لیے کوئی امام یا امیر ہونا چاہیے۔

”جواب الجواب دیتے ہوئے اہل حدیث مناظر نے کہا کہ پھر سرِ دست آپ کی امامت مالِ زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے ہے، اگر زکوٰۃ دینے والے انکاری ہوجائیں تو آپ ان کا کچھ نہیں کرسکتے۔

”اس کا جواب امامیہ مناظر نے کچھ نہیں دیا۔ ہاں ان کے اَتباع فساد پر آمادہ نظر آتے تھے، مگر پولیس کے حسنِ انتظام سے فساد تک نوبت نہیں پہنچی۔ الحمد للہ کہ اس مناظرے کا اثر غیر جانب دار افراد پر بھی بہت اچھا ہوا۔“

(راقم عطاء اللہ لکھوی)

دینی مسائل کی تعبیر میں اختلاف کوئی بُری بات نہیں ہے۔ اختلاف ہوتا رہتا ہے۔ اس سے نہ کوئی اسلام سے خارج ہوتا ہے، نہ اس کے لیے جنت سے محرومی لکھی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں فراخ دلی کا ثبوت دینا چاہیے۔ اختلاف کو کفر و اسلام کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے۔



گیارھواں باب

چند رفقاے کرام

مولانا احمد الدین گکھڑوی کے رفقاے کرام کی تعداد کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔ بے شمار لوگ ان کی رفاقت میں رہے اور لاتعداد لوگوں نے ان سے مراسم پیدا کیے۔ ان حضرات میں علماء بھی شامل ہیں اور غیر علما بھی۔ واعظین بھی شامل ہیں اور مدرسین بھی۔ لیکن یہاں صرف ان چند بزرگانِ دین کا ذکر کرنا مقصود ہے، جنھوں نے ان کے ساتھ مل کر اور ان سے قریب رہ کر دین کی خدمت کو اپنا شب و روز کا مشغلہ بنایا یا ان کی معیت میں مختلف مسالک کے اہل علم سے مناظرے کیے۔ ایسے بزرگوں کی تعداد بھی بے شک بہت ہوگی، لیکن ان سطور میں صرف سات حضرات کا ذکر کیا جائے گا۔

1۔ حافظ محمد یوسف گکھڑوی

حافظ محمد یوسف تبلیغ اسلام کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔ وہ سراپا اخلاص بزرگ تھے اور مسلک اہل حدیث کے بہت بڑے داعی اور مبلغ۔ مولانا احمد الدین گکھڑوی کے شاگرد تھے اور انتہائی جوش و جذبے سے تقریر کرتے تھے۔ ان کے والد مکرم نے گکھڑ میں اپنے ملکیتی مکان میں اپنی گرہ سے مسجد اہل حدیث تعمیر کرائی، جس کا نام مسجد توحید گنج رکھا۔ اس شہر میں یہ اہل حدیث کی پہلی مسجد تھی۔ تعمیرِ مسجد کے کچھ عرصے بعد اس میں ناظرہ اور حفظ قرآن کا مدرسہ جاری کیا گیا، جس میں شہر کے بہت سے بچوں نے ناظرہ قرآن مجید بھی پڑھا اور قرآن حفظ بھی کیا۔ حفظ قرآن کے لیے مقامی طلبا کے علاوہ شہر سے باہر کے طلبا بھی مدرسے میں داخل ہوئے۔ عام طور سے باہر کے بیس پچیس طلبا ہمیشہ حفظِ قرآن میں مشغول

رہتے تھے، جن کے کھانے کا انتظام بھی کیا جاتا تھا۔

حافظ محمد یوسف گکھڑوی اور مولانا احمد الدین گکھڑوی نے باہمی تعاون سے گکھڑ شہر اور اس کے قرب وجوار میں اہل حدیث کی بڑی تبلیغ کی اور ان کی تبلیغ سے متاثر ہو کر بے شمار لوگوں نے توحید وسنت کی صراط مستقیم کو اپنایا اور وہ قرآن وحدیث کے عامل ہوئے۔

مولانا احمد الدین گکھڑوی کے اس مخلص ترین شاگرد اور ساتھی نے 7۔مئی 1980ء کو گوجراں والا میں وفات پائی اور ان کا جنازہ مولانا عبدالرشید مجاہد آبادی نے پڑھایا۔

2۔ مولانا عبدالمجید خادم سوہدروی

مولانا احمد الدین گکھڑوی کے ہم ضلع علما میں سے مولانا عبدالمجید خادم سوہدروی کا نام نامی قابل ذکر ہے۔ وہ مشہور مقرر اور معروف مناظر تھے۔ حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کے نواسے تھے۔ ان کے دادا مولانا غلام نبی سوہدروی نہایت متقی عالم دین تھے جو حضرت حافظ محمد لکھوی اور حضرت میاں سید نذیر حسین دہلوی کے شاگرد اور حضرت سید عبداللہ غزنوی کے فیض یافتہ تھے۔ مولانا عبدالمجید کے والد بھی اپنے عہد کے ممتاز عالم تھے، جن کا اسم گرامی مولانا عبدالحمید تھا۔

مولانا عبدالمجید سوہدروی جنوری 1901ء میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے تصنیف وتالیف اور تقریر وخطابت میں بڑی شہرت پائی۔ مولانا احمد الدین گکھڑوی نے ان کے ساتھ ملک کے بہت سے تبلیغی اجتماعات میں شرکت کی اور دونوں زندگی بھر کتاب وسنت کی ترویج میں مشغول رہے۔ مولانا عبدالمجید سوہدروی نے 6۔نومبر 1959ء کو وفات پائی۔ ان کا تذکرہ اس کتاب کے دوسرے باب میں (بہ سلسلہ گوجراں والا کے چند علمائے کرام) ہو چکا ہے۔

3۔ حافظ اسماعیل روپڑی

حافظ اسماعیل روپڑی 1908ء کے پس وپیش پیدا ہوئے۔ حضرت حافظ عبداللہ

روپڑی کے حقیقی بھتیجے تھے۔ انہی سے تعلیم حاصل کی اور انہی کی تربیت میں رہے۔ بہت اچھے خطیب تھے۔ خوش گفتار، خوش لباس اور بلند اخلاق عالم دین۔ فنِ مناظرہ میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ مرزائی لٹریچر پر بڑی نظر تھی اور مرزا غلام احمد پر خوب صورت انداز سے ان کی کتابوں کے حوالے دے کر تنقید کرتے تھے۔

حافظ عبدالقادر روپڑی کے بڑے بھائی تھے۔ دونوں بھائیوں کی تقریریں لوگ دلچسپی سے سنتے تھے۔

حافظ اسماعیل طویل عرصے تک بیمار رہے۔ انھیں کینسر ہو گیا تھا۔ لیکن اس خطرناک بیماری میں بھی ان کا حوصلہ بلند رہا۔ عیادت کرنے والوں سے خندہ پیشانی سے ملتے۔

بہت سے جلسوں اور مناظروں میں مولانا احمد الدین گکھڑوی سے ان کی رفاقت رہی۔ صرف 54۔55 برس عمر پائی۔ 12۔ جنوری 1962ء کو فوت ہوئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اس قسم کے خوش کلام عوامی مقرر اب کہاں پیدا ہوں گے۔

4۔ حافظ عبدالقادر روپڑی

مولانا احمد الدین گکھڑوی کے خاص احباب میں سے تھے، ان کا بے حد احترام کرتے اور انھیں استاذ المناظرین کہا کرتے تھے۔ خود اپنا بھی انھیں استاذ قرار دیتے تھے۔

1911ء میں پیدا ہوئے۔ دینیات کی تعلیم اپنے عمِ محترم حضرت حافظ عبداللہ محدث روپڑی سے حاصل کی۔ تحصیل علم کے بعد اپنے آپ کو خدمتِ دین کے لیے وقف کر دیا۔ تقریر اور مناظرے میں مہارت رکھتے تھے۔ مرزائیوں اور شیعوں سے بے شمار مناظرے کیے۔ احناف کے دونوں گروہوں (بریلوی اور دیوبندی حضرات) سے بھی ان کے مباحثوں اور مناظروں کا سلسلہ جاری رہا۔

مولانا احمد الدین گکھڑوی کے متعدد مناظروں میں شرکت کی، سامع کی حیثیت سے بھی اور معاونِ مناظرہ کی حیثیت سے بھی۔!

مرزائیت کے خلاف پاکستان میں جتنی تحریکیں اٹھیں اور جو جدوجہد ہوئی، ان سب میں رہنما کی حیثیت سے شرکت کی۔ اس سلسلے میں قید بھی ہوئے اور کافی عرصہ جیل میں رہے۔ ملکی سیاسیات میں بھی حصہ لیا۔

جب تک حافظ اسماعیل روپڑی تندرست رہے، دونوں بھائی اکھٹے جلسوں میں جاتے اور تقریریں کرتے تھے۔ حضرت حافظ عبداللہ روپڑی نے دونوں کی بہترین طریقے سے تربیت کی اور طویل عرصے تک دونوں کو اپنے پاس (روپڑ) رکھا۔ پھر حضرت حافظ صاحب امرتسر تشریف لے گئے تو روپڑ میں ان دونوں بھائیوں کا سلسلہ دعوت وتبلیغ جاری رہا۔

حافظ عبدالقادر روپڑی نے 6۔ دسمبر 1999ء کو لاہور میں وفات پائی۔

5۔ مولانا محمد حسین شیخوپوری

مولانا محمد حسین ضلع امرتسر کی تحصیل اجنالا کے ایک گاؤں ''بوہلیاں'' میں 1918ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کا آغاز گاؤں کے ایک شخص ملا غلام نبی سے کیا۔ چھ سال کی عمر میں ایک قریبی گاؤں جستروال کے لوئر مڈل سکول میں داخل ہوئے اور بارہ سال کی عمر میں چھٹی جماعت کا امتحان پاس کیا۔

اس کے بعد دینی تعلیم کے حصول کا مرحلہ پیش آیا۔ اس کے لیے کمیر پور کا انتخاب ہوا جو اس نواح میں اہل حدیث کا مرکز تھا۔ روپڑی حضرات کا اصل مسکن یہی قصبہ تھا اور ان میں جو حضرات وہاں تعلیم دیتے تھے، وہ تھے مولانا حافظ محمد حسین، حافظ عبدالرحمٰن، مولانا اللہ بخش کمیر پوری اور بعض دیگر حضرات۔

مولانا محمد حسین مروجہ تعلیم کی تکمیل کی منزل کے قریب پہنچے تو ان کے والد بیمار ہو گئے اور بیماری نے جلد ہی شدت اختیار کر لی اور مجبوراً تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔ اب وہ باپ

کی خدمت اور گھریلو کاموں میں مصروف ہو گئے تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی گاؤں میں وعظ وتقریر کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ مشہور خطیب ہو گئے۔ پاکستان میں اللہ تعالیٰ نے مزید انعام سے نوازا اور بڑی شہرت عطا فرمائی۔ انھوں نے مولانا احمد الدین گکھڑوی کے ساتھ تقریروں اور مناظروں میں شرکت کی اور ان کے معاون ہوئے۔

مولانا محمد حسین نے 5۔ اگست 2005ء کی رات کو اپنے مسکن شیخوپورہ میں وفات پائی اور دوسرے روز 6۔ اگست کو مولانا معین الدین لکھوی نے ان کا پہلا جنازہ پڑھایا۔ دوسرا حافظ محمد یحییٰ میر محمدی نے اور تیسرا کسی اور صاحب نے پڑھایا۔ یکے بعد دیگرے تین جنازے پڑھے گئے، جن میں شریک ہونے والوں کی تعداد حدِ شمار سے بہت آگے تھی۔

6۔ مولانا نور حسین گھرجاکھی

مولانا احمد الدین گکھڑوی کے ایک ساتھی اور رفیق مناظرہ مولانا نور حسین گھرجاکھی تھے۔ مولانا نور حسین 1893ء میں پیدا ہوئے۔ دس سال کی عمر تھی کہ والد وفات پا گئے۔ اب گھر میں غربت کے سائے لہرانے لگے اور نور حسین کو محنت مزدوری کرنا پڑی۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر میں حصولِ علم کا شوق پیدا ہوا۔ اس وقت گوجراں والا کی مسجد اہل حدیث (چوک نیائیں) میں مولانا علاء الدین مرحوم خطبۂ جمعہ دیتے تھے اور محدود سے پیمانے پر انھوں نے مسجد میں مدرسہ بھی جاری کر رکھا تھا۔ اس مدرسے میں مولانا نور حسین نے ان سے تحصیل علم کا سلسلہ شروع کیا۔ کثرتِ آبادی کی وجہ سے اب تو گھرجاکھ کو گوجراں والا کے ایک محلے کی حیثیت حاصل ہے، اس وقت یہ گوجراں والا سے ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر ایک گاؤں تھا۔ مولانا نور حسین نمازِ فجر سے پہلے گھرجاکھ سے چلتے اور گوجراں والا کی جامع مسجد اہل حدیث میں مولانا علاؤالدین کی اقتدا میں نماز پڑھتے۔ نماز کے بعد پڑھائی شروع ہو جاتی۔

مولانا نور حسین نے ناظرہ قرآن مجید سے پڑھائی کا آغاز کیا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ مولانا علاء الدین سے دینیات کی تعلیم مکمل کر لی۔ وعظ و تبلیغ کا بھی انھیں شوق تھا۔ یہ شوق

پورا کرنے کے لیے پہلے مسجد میں وعظ کہنے لگے۔ پھر رفتہ رفتہ آگے قدم بڑھائے اور شہر کے اردگرد کے دیہات میں ان کی آواز پہنچی۔ پنجابی کے شاعر بھی تھے۔ اس وقت لوگوں کو پنجابی شاعری سے دلچسپی تھی۔ مولانا نور حسین نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ اس طرح ان کے وعظوں کا دائرہ مزید وسیع ہوا۔

وہ مناظروں اور مباحثوں کا دور تھا، کہیں مرزائیوں سے بحثیں ہو رہی ہیں، کہیں عیسائیوں، شیعوں اور بریلویوں سے مناظرے ہو رہے ہیں۔ مولانا نور حسین بھی اس میں حصہ لینے لگے اور جلد ہی بہت اچھے واعظ کے علاوہ مشہور مناظر بھی ہو گئے۔ مولانا احمد الدین کی معیت میں ان کے معاون کے طور پر بھی انھوں نے بعض مسالک کے مناظرین سے مناظرے کیے اور تنہا بھی کیے۔

انھوں نے 18۔ دسمبر 1951ء کو وفات پائی۔

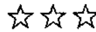
7۔ مولانا عبداللہ ثانی

مولانا احمد الدین گکھڑوی کے ایک ساتھی مولانا عبداللہ ثانی تھے جو 1900ء کے پس و پیش امرتسر میں پیدا ہوئے۔ وہ حضرت مولانا ثناءاللہ امرتسری کے خاص تربیت یافتہ اصحاب علم میں سے تھے۔ تقریر و خطابت میں انھوں نے بڑا نام پایا۔ تقسیم ملک سے قبل اخبار ''اہل حدیث'' (امرتسر) میں کام کرتے اور مضامین لکھتے رہے۔ مناظروں اور مباحثوں میں بھی حصہ لیا۔ دھیمے انداز کے خطیب تھے اور زبان میں اثر تھا۔ بعض مناظرات میں مولانا احمد الدین گکھڑوی کا سہارا بنے اور ان کی معاونت کی۔ دراصل امرتسر کے محلّہ ڈھاب کھٹیکاں کے رہنے والے تھے اور وہاں کی مسجد اہل حدیث کے خطیب تھے۔

قیام پاکستان کے زمانے میں جڑاں والا (ضلع فیصل آباد) میں سکونت اختیار کی اور وہاں کی جامع مسجد اہل حدیث کے منصب خطابت پر فائز ہوئے۔ پاکستان کی جمعیت اہل حدیث کے اہم رکن تھے۔

تقریباً 83 سال کی عمر پا کر 7۔ستمبر 1983ء کو لاہور میں انتقال کیا۔

قیامِ پاکستان پہلے جڑاں والا میں جماعت اہل حدیث کی کوئی مسجد نہ تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد جڑاں والا اور اس کے ارگرد کے دیہات میں فرید کوٹ، ضلع امرتسر اور دیگر مقامات کے بے شمار اہل حدیث آباد ہوئے۔ ان میں علمائے دین بھی بڑی تعداد میں شامل تھے۔ لیکن جڑاں والا شہر کو جن اہل حدیث علمائے دین نے اپنا مسکن بنایا وہ تھے حافظ احمد پٹوی اور مولانا عبداللہ ثانی امرتسری۔ دونوں بزرگ مشہور واعظ اور مشہور عالم تھے، اور دونوں نے اپنے اپنے انداز میں دین کی بڑی خدمت کی۔ مسئلے مسائل کے لیے لوگ انھی سے رجوع کرتے تھے۔ مختلف مقامات میں وعظ و تبلیغ کے لیے بھی انھیں بلایا جاتا تھا اور یہ تشریف لے جاتے تھے۔ حافظ احمد پٹوی معروف طبیب بھی تھے اور جڑاں والا میں ان کا مطب تھا۔ دونوں اپنی اپنی باری سے اللہ کے دربار میں پہنچ گئے۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔



بارھواں باب

چند واقعات ولطائف

مولانا احمد الدین گکھڑوی کے متعلق دیکھنے والے کو بہ ظاہر یہی گمان گزرتا تھا کہ سخت طبیعت اور خشک مزاج ہیں، اگرچہ یہ بھی صحیح ہے، لیکن وہ خوش مزاج اور خوش طبع بھی تھے۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو:

تقسیم ملک سے بہت سال پہلے کی بات ہے کہ انھیں ہمارے ہاں کوٹ کپورہ (سابق ریاست فرید کوٹ) کی انجمن اصلاح المسلمین کے سالانہ جلسے میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ ان کے علاوہ مولانا لال حسین اختر، مولانا عبداللہ معمار امرتسری اور مولانا حافظ محمد حسین روپڑی کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ یہ حضرات وہاں تشریف لے گئے تھے اور انھوں نے انجمن اصلاح المسلمین کے جلسۂ عام میں تقریریں کی تھیں۔ اس زمانے میں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی وہاں خطابت وتدریس کے فرائض سرانجام دیتے تھے۔

کوٹ کپورہ سے نو دس کلومیٹر کے فاصلے پر ایک گاؤں شیر گھری تھا۔ اس گاؤں میں دو تین گھر مرزائیوں کے تھے، جنھوں نے قادیان سے کسی مرزائی مبلغ کو بلایا تھا اور اس نے مسلمانوں کو مناظرے کا چیلنج کیا تھا۔ انجمن کے جلسے کے موقعے پر شیر گھری کے مسلمانوں کے ایک نمائندے ثناء اللہ بھٹی صاحب کوٹ کپورے تشریف لائے اور مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی اور انجمن کے بعض ارکان سے ملے۔ وہ چاہتے تھے کہ دو چار علمائے کرام کو ان کے گاؤں بھیجا جائے تاکہ مرزائی مبلغ کے چیلنج کا جواب دیا جا سکے اور مرزائیت کے موضوع پر تقریریں کی جائیں۔ ثناء اللہ بھٹی صاحب بڑے وجیہ اور ملنسار بزرگ تھے۔ بے

حد مخلص اور کتاب وسنت کے پیرو کار۔!

کوٹ کپورہ سے شیر گھری جانے کے لیے تین چار اونٹوں کا انتظام کیا گیا۔ فیصلہ ہوا کہ مولانا احمد الدین گکھڑوی، مولانا لال حسین اختر، مولانا عبداللہ معمار، حافظ محمد حسین روپڑی اور مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی وہاں جائیں گے۔ سواری کے لیے مولانا احمد الدین کے حصے میں اونٹنی آئی۔ وہ اونٹنی پر سوار ہوئے تو کہا: مولوی عطاء اللہ!

"اذا العشار اُتیے لت"

یہ بالکل برمحل الفاظ تھے، جسے سن کر ایک خوش گوار قہقہہ بلند ہوا۔ مذکورہ بالا علمائے خمسہ (پنج تن پاک) کے علاوہ جو عام لوگ وہاں گئے، میں بھی ان میں شامل تھا۔ میری عمر اس وقت دس گیارہ سال کی ہوگی۔ لیکن اس چھوٹی عمر میں مجھے اس قسم کے اجتماعات میں حاضر ہونے اور علماء کی تقریریں سننے کا بڑا شوق تھا۔

ان حضرات نے وہاں جاتے ہی جلسہ شروع کر دیا۔ مرزائی مبلغ اور دیگر مرزائیوں کو دعوت دی گئی، لیکن کوئی سامنے نہیں آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا احمد الدین گکھڑوی کا سامنا کرنے سے حریف بہت گھبراتے تھے۔ ان کے بعض مخالف تو ان کا نام سنتے ہی اِدھر اُدھر کھسک جاتے تھے۔

چند اور واقعات سنیے!

تقسیم ملک سے پہلے کی بات ہے۔ دوسری عالم گیر جنگ کا زمانہ تھا اور یہ جنگ چھ سال جاری رہی تھی۔ ستمبر 1939ء میں شروع اور جولائی 1945ء میں ختم ہوئی تھی۔

ماہ وسال کا تعین کرنا تو مشکل ہے۔ اسی جنگ کے دنوں میں رائے ونڈ میں ایک تبلیغی جلسہ منعقد ہوا۔ اس میں تقریر کے لیے مولانا احمد الدین گکھڑوی کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ مولانا نے پنجابی میں تقریر کرتے ہوئے ان غیر شرعی رسوم کا تذکرہ کیا جو مسلمانوں میں رائج ہوگئی ہیں۔ حاضرین میں سے کسی نے بلند آواز سے کہا: ان رسوم کے رائج ہونے میں

انگریزی تہذیب کا بھی دخل ہے۔

مولانا نے ہماری روزمرہ کی عام بول چال کی پنجابی زبان میں فرمایا:

''انگریزاں نوں مارو گولا، ساڈا اپنا چال چلن ای وگڑ گیا اے۔''

(انگریزوں کو مارو گولا، ہمارا اپنا چال چلن ہی بگڑ گیا ہے۔)

پولیس کا جو اہل کار مقررین کی تقریریں لکھنے کے لیے آیا تھا، اس نے مولانا کے وہی الفاظ لکھ لیے کہ ''انگریزاں نوں مارو گولا۔''

جنگ کا نازک تریں زمانہ۔ ملک پر انگریزوں کی حکومت۔ ادھر انگریزی حکومت کے خلاف کانگرس کی ''ہندوستان خالی کرو'' تحریک بھی چل رہی تھی، جس میں بعض مقامات پر مظاہرین کی طرف سے تشدد کے واقعات بھی ہوئے۔ مولانا کے یہ الفاظ: ''انگریزاں نوں مارو گولا'' تھانے کے اعلیٰ افسروں تک پہنچے تو انھوں نے روزمرہ کے محاوراتی انداز کے بجائے اسے سنجیدگی کے معنوں میں لیا اور نتیجہ یہ نکالا کہ مولانا احمد الدین نے لوگوں کو تشدد پر ابھارا ہے۔ چنانچہ پولیس والے انھیں تھانے لے گئے۔

یہ انتہائی گھمبیر صورت حال تھی۔ جلسے کے منتظمین اور شہر کے بعض سرکردہ حضرات تھانے گئے اور پولیس کو مولانا کے سیاقِ کلام میں اس لفظ کے محلِ استعمال سے آگاہ کیا تو معاملہ رفع دفع ہوا۔

مولانا احمد الدین مہمان نواز تھے اور ان کا حریف بھی ان کے گھر آتا تو اس کی خدمت کرتے۔ بعض دفعہ اسے خود اپنے گھر بلاتے۔ ذیل میں اس کی دو مثالیں ملاحظہ ہوں۔

ان کے بھتیجے جناب مرزا محمد یونس (کھوکھر کی گوجراں والا) بیان کرتے ہیں کہ گکھڑ منڈی کے مغربی محلے میں مرزائیوں کی مسجد تھی۔ مرزائی جب اپنے کسی مقرر کو تقریر کے لیے بلاتے تو بعض اوقات وہ مقرر ہمارے گھر بھی آجاتا اور کچھ دیر مولانا احمد الدین سے باتیں کرتا۔ مولانا اخلاقاً موسم کے مطابق اسے چائے یا شربت پلاتے۔ وہ چلا جاتا تو فرماتے

کہ جن برتنوں میں اسے کھانے پینے کی چیزیں دی گئی ہیں، وہ برتن اندر نہ لے جانا، وہ برتن باہر رکھواور رحمتے عیسائن کو دے دو جو ہمارے گھر صفائی کے لیے آتی ہے۔ ہم ان سے اس کی وجہ پوچھتے تو فرماتے: مرزائی کافر ہیں۔ جن برتنوں کو یہ ہاتھ لگادیں یا جن کو یہ استعمال میں لائیں، ہمیں ان برتنوں میں کھانا پینا نہیں چاہیے۔

پہلے بیان کیا جاچکا ہے کہ مولانا سرفراز صفدر سے جو احناف کے دیوبندی مسلک سے تعلق رکھتے تھے، مولانا احمدالدین کے مراسم میں کچھ اوتار چڑھاؤ سا آیا۔ لیکن جب مولانا سرفراز حج کرکے آئے تو مولانا ممدوح ملاقات کے لیے ان کے گھر گئے۔ انھیں حج کی مبارک باد دی۔ پھر ان کی دعوت کی اور اپنے گھر بلایا۔

اختلاف کے باوجود مولانا احمدالدین میل ملاقات کے عادی تھے اور مہمان نوازی ان کا قابلِ ذکر وصف تھا۔

حضرت مولانا ثناءاللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں سنا ہے کہ ان کا کوئی ایسا حریف جو امرتسر سے باہر کے کسی مقام سے ان کے ساتھ مناظرے کے لیے آتا تو مناظرے کے بعد وہ اسے اپنے ہاں قیام کی دعوت دیتے۔ وہ یقیناً ان کے ہاں قیام نہیں کرتا ہوگا، انہی لوگوں کے ہاں ٹھہرتا ہوگا، جنھوں نے اسے مناظرے کے لیے بلایا ہوگا، لیکن مولانا کا اخلاق انھیں مجبور کرتا تھا کہ اسے اپنے ہاں ٹھہرنے کی دعوت دی جائے۔

ہفت روزہ الاعتصام کے مینیجر جناب محمد سلیم چنیوٹی کا ایک مضمون ”مناظر اسلام مولانا احمدالدین گکھڑوی“ کے عنوان سے 28۔مئی 2010ء کے الاعتصام میں شائع ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے ڈاکٹر محمد یوسف فاروق کے حوالے سے دو دلچسپ واقعے بیان کیے ہیں۔

جی چاہتا ہے ان سطور کے خوانندگانِ محترم کو بھی ان واقعات میں شامل کرلیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب بیان کرتے ہیں:

"بریلوی علما میں ایک مشہور نام مولانا عبدالغفور ہزاروی کا تھا۔ وہ معروف خطیب اور واعظ تھے۔ وزیرآباد رہتے تھے۔ مناظرانہ شہرت بھی رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ مولانا احمد الدین گکھڑوی ان کے محلے میں تشریف لے گئے اور لوگوں سے کہا کہ جاؤ عبدالغفور سے کہو احمدالدین آیا ہے۔ اگر وہ میرا نام سن کر اپنی مسجد سے باہر آگئے تو میں شہر چھوڑ دوں گا۔ چنانچہ ان کا نام سن کر مولانا عبدالغفور مسجد سے باہر نہیں آئے۔"

(1) ۔ ڈاکٹر محمد یوسف فاروق ہمارے کرم فرما حکیم عبدالمجید مرحوم کے صاحب زادے اور استاذِ مکرم حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کے بھتیجے ہیں۔ عالم و مخلص ترین خاندان کے نہایت مخلص اور صاحب علم رکن۔ وزیرآباد کے علاقہ ماڈل ٹاؤن میں انھوں نے ایک ہسپتال قائم کیا ہے۔ ماشاء اللہ علمی اداروں سے ان کا تعاون جاری رہتا ہے۔ ان کے بڑے بھائی حکیم عتیق الرحمٰن بھی بڑے خوش اخلاق اور خوش کردار ہیں۔

اب ڈاکٹر محمد یوسف فاروق کی زبانی دوسرا واقعہ سنیے!

"وزیرآباد کے نواح میں ایک گاؤں دادوالی شریف میں ایک پیر میاں بڈھا نامی سکونت پذیر تھے اور پیری مریدی کرتے تھے۔ ان لوگوں نے بعض اختلافی مسائل نور و بشر، حاضر و ناظر اور نور من نوراللہ وغیرہ پر اہل حدیث کو مناظرے کا چیلنج دیا جو قبول کر لیا گیا۔ مولانا احمدالدین گکھڑوی اور مولانا محمد اسماعیل سلفی کو مناظر مقرر کیا گیا۔ مناظرہ شروع ہوا، لیکن جب بریلوی حضرات نے دیکھا کہ دلائل کی رو سے اہل حدیث غلبہ پا رہے ہیں اور معاملہ ہاتھ سے نکلتا جا رہا ہے تو مولانا عبدالغفور ہزاروی کھڑے ہوئے اور بریلوی حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا: "اے مسلمان کہلانے والے بے غیرت لوگو! تمھارے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بے حد خوب صورت اور پھولوں سے زیادہ خوشبودار تھے۔ لوگو! تم پر عذاب الٰہی نازل ہو، تم سن نہیں رہے کہ وہابی بار بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو "کالا کالا" کہہ رہے ہیں۔ تم وہابیوں کی اس گستاخی پر کیوں خاموش ہو۔"

اس پر ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ لوگ کھڑے ہو گئے اور مناظرہ ختم ہو گیا۔

''اہل حدیث مناظر حوالے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حدیث پڑھتے تو ''قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم'' کے الفاظ سے شروع کرتے تھے۔ اس ''قال قال'' کو شکست سے بچنے کے لیے مولانا عبدالغفور ہزاروی نے ''کالا کالا'' میں بدل دیا۔''

بہر حال مولانا احمد الدین گکھڑوی فنِ مناظرہ کے تمام پہلوؤں پر حاوی تھے۔ مستحکم دلائل سے اپنے مدِ مقابل کا سامنا کرتے تھے۔ ہر مناظرے میں اللہ نے ان کو کامیابی عطا فرمائی۔ شکست سے بچنے کے لیے لوگ مناظروں میں ہنگامے بھی کرتے ہیں، جس سے مناظرے ادھورے رہ جاتے ہیں، مولانا احمد الدین گکھڑوی کے بعض مناظروں میں بھی فریقِ مخالف نے ہنگامے کیے۔ یہ کوئی بہت بڑی بات نہیں ہے۔ ہنگامہ آرائی بھی مناظرے کا حصہ ہے، جو اس وقت کی جاتی ہے، جب شکست سامنے نظر آ رہی ہو۔

مولانا احمد الدین گکھڑوی کے جن مرزائی مناظرین سے مناظرے ہوئے ان میں ''احمدیہ پاکٹ بک'' کے مصنف ملک عبدالرحمٰن خادم گجراتی، اللہ دتا المعروف ابوالعطا جالندھری، عبداللہ مبشر، غلام رسول، یار محمد اور سعد الدین وغیرہ شامل ہیں۔

محمد سلیم چنیوٹی 28۔ مئی 2010ء کے ''الاعتصام'' میں ڈاکٹر محمد یوسف فاروق کے حوالے سے مولانا احمد الدین گکھڑوی کے وعظ کے متعلق رقم طراز ہیں:

''مولانا احمد الدین جب وعظ فرماتے تو دائیں ہاتھ میں قرآن کریم پکڑتے اور بائیں ہاتھ سے اپنی قمیص کے ایک کونے کو مروڑتے رہتے۔ دورانِ تقریر جب کوئی تاکیدی جملہ کہنے کا موقع آتا تو بائیں ران پر مُکّا مارتے اور اپنی بات جوش سے سامعین کو سمجھانے کی کوشش فرماتے۔ اس عمل سے ان کی ران پر ایک سیاہی مائل نشان سا پڑ گیا تھا۔''

مجھے ان کی ران کے نشان کا تو علم نہیں، البتہ یہ بالکل صحیح ہے کہ وعظ کہتے ہوئے جب وہ جوش میں آتے تو بائیں ران پر زور سے مُکّا مارتے تھے۔ یہ معلوم نہیں انھوں نے بہ وقتِ

جوش مکا مارنے کے لیے ران کا انتخاب کیوں کیا تھا، جب کہ ایسے مواقع پر مقررین میز پر مکے مارتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا احمد الدین کی ہر ادا نرالی تھی اور ہر معاملے میں وہ انفرادیت رکھتے تھے۔ وعظ وتقریر میں بھی ان کا ایک خاص انداز تھا، مناظرے میں بھی ان کا الگ رنگ تھا اور مجلسی گفتگو میں بھی انھیں دوسروں سے امتیاز حاصل تھا۔ میرے عزیز دوست مولانا عارف جاوید محمدی نے مجھے ایک کتاب بھیجی ہے جس کا نام ''تاریخ اہل حدیث جموں وکشمیر'' ہے۔ یہ کتاب صوفی احمد مسلم کی تصنیف ہے اور جمعیت اہل حدیث جموں وکشمیر (سری نگر) کی طرف سے شائع کی گئی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ کسی زمانے میں کشمیر کے ایک عالم دین مولانا محمد عمر، حضرت مولانا ثناءاللہ کی خدمت میں امرتسر پہنچے اور کشمیر کے شہر پونچھ میں اہل حدیث کی مسجد بنانے کے متعلق عرض کیا تو مولانا مرحوم نے بلاتوقف مسجد کے لیے پانچ سو روپے کی تھیلی پیش کی۔ یہ رقم وصول کرتے ہوئے مولوی محمد عمر نے حضرت مولانا سے سوال کیا کہ آپ نے یہ رقم مجھے کیسے دے دی جب کہ آپ پہلے مجھ سے کوئی تعارف نہیں رکھتے؟ مولانا امرتسری نے جواب میں فرمایا اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں یہ بات القاء کی ہے کہ آپ کا بیان صحیح ہے۔ اسی کو کہتے ہیں ''دل را بدل رہیست'' اور یہ اس وعدۂ خداوندی کا ایک کھلا ثبوت ہے۔

﴿والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا وان اللہ لمع المحسنین﴾

پھر جب پونچھ کی مسجد اہل حدیث تعمیر ہوگئی اور جمعہ وجماعت کا سلسلہ شروع ہوگیا تو وہاں تبلیغ کے سلسلے میں مولانا احمد الدین گکھڑوی اور مولانا نور حسین گھرجاکھی بھی تشریف لے گئے۔

اسی کتاب میں لکھا ہے کہ ایک عالم دین نے حقارت آمیز انداز میں مولانا احمد الدین کے متعلق کہا کہ یہ لوہار ہیں اور ہم لوہار سے مناظرہ نہیں کرنا چاہتے۔ اس پر مولانا جوش میں آگئے۔ فرمایا: یہ میرے ساتھ اس لیے مناظرہ نہیں کرنا چاہتا کہ میں اسے ایسا پھاناں ٹھوکوں گا کہ یہ عمر بھر یاد رکھے گا۔ (تاریخ اہل حدیث جموں وکشمیر صفحہ 241۔242)

تیرھواں باب

خطیب کی حیثیت سے

مولانا احمد الدین بہت بڑے مناظر تو تھے ہی، علاوہ ازیں صاف گفتار مقرر اور ممتاز خطیب بھی تھے۔ایک زمانہ تھا کہ مذہبی اور دینی جماعتیں کسی مرکزی مقام پر سالانہ تبلیغی جلسوں کا اہتمام کیا کرتی تھیں۔ جماعت اہل حدیث میں اس قسم کے جلسوں کا خاص طور سے رواج تھا۔ یہ بہت اچھا رواج اور بہت اچھا سلسلہ تھا۔اس سے دین کی تبلیغ بھی ہوتی تھی اور جماعتوں کے نظم میں بھی مضبوطی آتی تھی۔مختلف مقامات کے جو لوگ جلسہ سننے آتے، ان میں بھی تعلقات استوار ہو جاتے تھے اور یہ پتا چل جاتا تھا کہ کس علاقے میں جماعت کی کیا حیثیت ہے۔جلسوں میں تشریف لانے والے علمائے کرام کے بھی آپس میں روابط قائم رہتے تھے اور ان میں استحکام پیدا ہوتا تھا۔بعض دینی مدارس کے بھی سالانہ جلسے منعقد کیے جاتے تھے۔اس سے ان مدارس کی شہرت بھی ہوتی اور ان کی مالی امداد کی صورت میں پیدا ہو جاتی تھی۔ان جلسوں میں جن علمائے کرام کو دعوت شرکت دی جاتی تھی، ان میں مولانا احمد الدین گکھڑوی بھی تھے، اس لیے کہ وہ جماعت کے مشہور مقرر تھے اور خالص کتاب وسنت کے عنوانات پر تقریر کرتے تھے۔

مولانا ممدوح ان جلسوں کے علاوہ متعدد مقامات کی مساجدِ اہل حدیث میں بھی خطابت کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔

جامع مسجد اہل حدیث وزیر آباد

وزیر آباد (ضلع گوجراں والا) کی جس مسجد میں حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی

تدریس و خطابت میں مصروف رہے، اس مسجد اور ان کے جاری کردہ مدرسے نے پورے متحدہ ہندوستان میں شہرت پائی اور علما وطلبا کی کثیر تعداد نے حضرت حافظ صاحب سے استفادہ کیا۔ ان کی وفات کے بعد یہ ذمہ داری ان کے شاگرد رشید مولانا عمر الدین کے سپرد ہوئی، جن کا تذکرہ کتاب کے دوسرے باب میں کیا گیا ہے۔ انھوں نے سفر آخرت اختیار کیا تو اس مسجد کی خطابت کی ذمہ داری مولانا احمد الدین گکھڑوی کو سونپی گئی۔ مولانا ممدوح کچھ عرصہ اس منصب پر فائز رہے۔ اس کے بعد حالات نے ایسی کروٹ لی کہ مولانا کو اس سے علیحدہ ہونا پڑا۔ یہ قیامِ پاکستان سے قبل کی بات ہے۔ جماعتی معاملات بدلتے رہتے ہیں، کبھی خوش گوار حالات سے واسطہ پڑتا ہے اور کبھی ناخوش گوار واقعات رونما ہو جاتے ہیں۔ بہر حال مولانا احمد الدین گکھڑوی کچھ عرصہ حضرت حافظ عبدالمنان صاحب کی جامع مسجد اہل حدیث (وزیر آباد) میں خطبۂ جمعہ ارشاد فرماتے رہے۔

جامع مسجد اہل حدیث فیصل آباد

کچھ مدت جامع مسجد اہل حدیث (امین پور بازار) فیصل آباد میں بھی مولانا احمد الدین کے خطبۂ جمعہ کا سلسلہ جاری رہا۔ یہ فیصل آباد شہر کی پہلی مسجد اہل حدیث ہے۔ 36-1935ء میں اس شہر کے چند افراد ہی مسلکِ اہل حدیث سے وابستہ تھے۔ انھوں نے انجمن اہل حدیث کے نام سے اپنی تنظیم قائم کر لی تھی۔ اس وقت شہر کی موثر ترین شخصیت حکیم نورالدین کی تھی جو وہاں کے سرکردہ اہل حدیث عالم تھے۔ لیکن ان کی دلچسپیوں کا زیادہ تر محور انگریز دشمن سیاست تھی اور شہر کے ہندو اور مسلمان سب ان کے سیاسی نقطۂ نظر کے مؤید تھے۔

لائل پور (موجودہ فیصل آباد) جلد ہی خاصے بڑے شہر کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ لیکن اس شہر میں اہل حدیث کی کوئی مسجد نہ تھی۔ البتہ حکیم صاحب موصوف منشی محلے کی ایک چھوٹی سی مسجد میں جو انھوں نے خود ہی تعمیر کرائی تھی، قرآن مجید کا روزانہ درس دیتے تھے۔ اسے خالص اہل حدیث کی مسجد نہیں قرار دیا جاتا تھا۔ اتنے بڑے شہر میں اہل حدیث کی مسجد نہ

ہونے کا اہل حدیث حضرات کو بہت احساس تھا۔ چنانچہ 30۔اگست 1936ء کو شہر کی انجمن اہل حدیث کی میٹنگ ہوئی، جس میں حسب ذیل قرارداد منظور کی گئی۔

''چوں کہ لائل پور شہر بڑا آباد ہونے کے علاوہ علاقے کا مرکز بھی ہے، جہاں ہر مذہب وملت کے عبادت خانے موجود ہیں۔اس طویل وعریض شہر میں جماعت اہل حدیث کی مسجد کی تعمیر ضروری ہے، جس میں سلفی عقیدے کے مطابق لوگ اجتماعی طور پر صلات پنجگانہ اور صلات جمعہ کی ادائیگی کا اہتمام کرسکیں۔علاوہ ازیں وہ درس قرآنِ مجید اور درس حدیث رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے مستفید ہوسکیں۔حکیم نورالدین صاحب سے گزارش کی جاتی ہے کہ وہ سیاسیات ملکی کے ساتھ اس اہم فریضے کی جانب بھی توجہ دیں۔نیز مولوی عبدالواحد صاحب کو انجمن کے پروپیگنڈا سیکریٹری نامزد کیا جاتا ہے۔''

اس کے بعد تعمیر مسجد کے لیے کچھ حرکت پیدا ہوئی اور جلد ہی اس میں تیزی آ گئی۔ مولانا عبدالواحد نے اس سلسلے میں بے حد بھاگ دوڑ کی۔ 11۔اکتوبر 1936ء کو مسجد مبارک (لاہور) میں پنجاب کے اہل حدیث حضرات کا ایک اجتماع ہوا۔اس میں انجمن اہل حدیث فیصل آباد کے نمائندے کی حیثیت سے مولانا عبدالواحد نے شرکت کی، یہاں مختلف حضرات سے ان کی ملاقات ہوئی اور فیصل آباد میں مسجد کی تعمیر کے متعلق تعاون کے لیے درخواست کی گئی۔

حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری نے بھی جگہ خریدنے اور مسجد تعمیر کرنے کے متعلق اخبار اہل حدیث میں اعلان کرنا شروع کر دیے۔وہ چاہتے تھے کہ جلد از جلد یہاں مسجد اہل حدیث کی تعمیر ہو۔بالآخر جگہ خریدی گئی اور 1945ء میں مسجد تعمیر ہو گئی۔تعمیر کی نگرانی مولانا عبدالواحد کے سپرد تھی۔اس مسجد کے پہلے امام بھی مولانا عبدالواحد کو مقرر کیا گیا تھا۔وہ نہایت دیانت دار اور باہمت بزرگ تھے۔انھوں نے صحاح ستہ کی سند 4۔رجب 1351ھ (3۔نومبر 1932ء) کو مولانا محمد علی لکھوی سے لی تھی جو اس وقت لاہور کی

چینیاں والی مسجد میں پڑھاتے تھے۔اس مسجد کے خطیب مولانا سید محمد داؤد غزنوی ان دنوں سیاسی قیدی کی حیثیت سے جیل میں تھے اور ان کی جگہ انہی کی تجویز سے چینیاں والی مسجد میں مولانا محمد علی لکھوی خدمات سرانجام دیتے تھے۔

جامع مسجد اہل حدیث امین پور بازار کی خطابت کا منصب مولانا محمد صدیق مرحوم کے سپرد بھی رہا اور مولانا احمد الدین گکھڑوی بھی یہاں کچھ عرصہ خطیب رہے۔اب کئی سال سے اس مسجد کے خطیب مولانا محمد یوسف انور ہیں، جو علماے کرام کے بے حد قدردان ہیں۔

مسجد مبارک (فیصل آباد)

مسجد مبارک اہل حدیث جو فیصل آباد کے منٹگمری بازار میں واقع ہے، اس شہر میں اہل حدیث کی دوسری مسجد ہے۔اس مسجد میں بھی کچھ عرصہ مولانا احمد الدین گکھڑوی خطبہ جمعہ ارشاد فرماتے رہے۔

مختصر الفاظ میں اس مسجد کی تاریخِ تعمیر یہ ہے کہ یہ احاطہ ایک بزرگ شیخ عبدالرحیم نے خریدا اور اسے مسجد کی تعمیر کے لیے وقف کر دیا۔اس علاقے کے ہندو مسجد کی تعمیر کے سخت خلاف تھے اور مسلمان مسجد تعمیر کرنا چاہتے تھے۔اتفاق سے انہی دنوں یہاں مولانا ابوالکلام آزاد اور گاندھی جی آئے۔ دونوں دھوبی گھاٹ کے قریب کہیں ٹھہرے تھے۔شہر کے چند مسلمان زعما ان کی خدمت میں گئے اور انھیں صورت حال سے مطلع کیا اور کہا کہ وہ اپنے اثر ورسوخ سے کام لے کر ہندوؤں کو مسجد کی تعمیر میں رکاوٹ پیدا کرنے سے روکیں۔انھوں نے جواب دیا یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں ہے، آپ بے فکر ہو کر مسجد تعمیر کریں۔چنانچہ مسجد تعمیر ہو گئی۔امین پور بازار کی جامع مسجد اہل حدیث کے بعد اس شہر میں اہل حدیث کی یہ دوسری مسجد ہے۔

اس مسجد میں بھی مولانا احمد الدین گکھڑوی کا کچھ مدت خطبۂ جمعہ کا سلسلہ جاری رہا۔ اب بہت سالوں سے اس کے منصبِ خطابت پر مولانا ارشاد الحق اثری فائز ہیں۔ادارہ علوم اثریہ بھی اسی مسجد میں قائم ہے۔اس کے سربراہ بھی مولانا ارشاد الحق اثری ہیں۔اس

ادارے میں متعدد اہل علم حضرات تصنیفی خدمات سرانجام دے رہے ہیں، جن میں مولانا عبدالحی انصاری کا نام نامی بھی شامل ہے۔ ادارہ علوم اثریہ کی طرف سے عربی اور اردو کی بہت سی اہم کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور مسلسل شائع ہو رہی ہیں۔ یہ ادارہ اللہ کے فضل سے ایک بڑی جماعت سے بھی زیادہ تصنیفی خدمات سرانجام دے رہا ہے۔

محلّہ مومن آباد کی مسجد اہل حدیث میں خطابت

محلّہ مومن آباد فیصل آباد شہر کے خاصے بڑے علاقے پر محیط ہے، جو قیام پاکستان کے بعد ان لوگوں نے آباد کیا جو مشرقی پنجاب کے بعض مقامات سے بہ طور پناہ گزین یہاں آئے۔ انھوں نے اس کا نام مومن آباد رکھا۔ یہاں مسجد تعمیر کی اور اس میں جمعہ و جماعت کا باقاعدہ انتظام کیا گیا۔ مومن آباد کے لوگ مالی اعتبار سے بھی آسودہ حال ہیں اور تدین و صالحیت کی نعمت بھی اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمائی ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ ان کی تعمیر کردہ مسجد کے اولیں خطیب کون صاحب تھے اور اب کون خوش قسمت عالم اس فریضے کی انجام دہی پر مامور ہیں، البتہ یہ معلوم ہے کہ اس مسجد کے منصب خطابت پر مولانا احمد الدین گکھڑوی بھی فائز رہے۔ وہ نہایت دبنگ خطیب تھے اور کلمۂ حق بلند کرنے میں بے حد جری۔

فیصل آباد کی ایک اور مسجد میں بھی مولانا احمد الدین خطیب رہے۔ اس مسجد کا نام مسجد فردوس ہے۔ جو گلبرگ (سی) میں ہے۔ بہر کیف مولانا احمد الدین نے مختلف اوقات میں فیصل آباد کی چار مسجدوں میں خدمتِ خطابت سرانجام دی۔ کس مسجد میں کب سے کب تک کتنا عرصہ رہے اور پھر اس خدمت سے کیوں دست بردار ہوئے؟ اس کا زیادہ پتا نہیں چل سکا۔

نظام آباد (وزیرآباد)

مولانا احمد الدین گکھڑوی کے بھتیجے جناب مرزا محمد یونس صاحب نے جو آج کل کھوکھر کی (گوجراں والا) میں مقیم ہیں، جناب محمد سلیم چنیوٹی مینیجر ''الاعتصام'' کے نام ایک خط میں تحریر کیا ہے کہ مرض الموت میں مبتلا ہونے سے پہلے پیرانہ سالی کے باوجود مولانا

احمد الدین، وزیر آباد کے قریب نظام آباد کی مسجد میں خطیب رہے۔ اس وقت ان کی رہائش گکھڑ میں تھی۔ مرزا محمد یونس لکھتے ہیں:

''میں خود ہر جمعہ کے روز انھیں گکھڑ منڈی کے بس اسٹاپ سے نظام آباد کے لیے بس پر بٹھانے جاتا تھا۔''

مولانا احمد الدین نے انیس بیس سال کی عمر میں مروجہ علوم سے فراغت حاصل کر لی تھی۔ طالب علمی کے زمانے میں بھی انھیں وعظ و تقریر کا بہت شوق تھا اور وہ کتاب و سنت کی روشنی میں تقریر کیا کرتے تھے۔ گکھڑ کی ایک مسجد میں بھی وہ کچھ عرصہ خطیب رہے۔ اندازہ یہ ہے کہ وہ اپنے شہر کی مسجد اہل حدیث میں جو ان کے شاگرد حافظ محمد یوسف صاحب کے والد مکرم نے تعمیر کرائی تھی، ضرور خطابت و امامت کے فرائض سرانجام دیتے رہے ہوں گے۔ اس طرح متعدد مقامات کی مساجد میں ان کا سلسلۂ خطابتِ جمعہ جاری رہا۔ لیکن یہ پتا نہیں چلتا کہ انھوں نے ان مقامات میں کتنا کتنا عرصہ یہ خدمت سرانجام دی۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ خطیب کی حیثیت سے ان کا ایک خاص مقام تھا۔

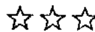
میں یہ بات اپنی بعض کتابوں کے مختلف مقامات میں عرض کر چکا ہوں اور زبانی بھی عرض کرتا رہتا ہوں، یہاں بھی نہایت دردمندی کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ جماعت اہل حدیث کے لوگوں کو اپنے علماے کرام کے حالات خاص ترتیب کے ساتھ قلم بند کرنے اور محفوظ رکھنے کی عادت نہیں ہے۔ ان کے علماے کرام نے اپنے اپنے حلقوں میں بے حد خدمات سرانجام دیں، تصنیف و تالیف کی صورت میں بھی، درس و تدریس کی شکل میں بھی، وعظ و تذکیر کے رنگ میں بھی اور افتا و استفتا کے انداز میں بھی۔ اس جماعت کے موجودہ دور کے علماے کرام بھی نہایت اہتمام و مستعدی کے ساتھ ان خدمات کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔

ملک کے تمام مقامات میں ان کی لاتعداد مساجد ہیں، جن میں درس و تدریس کے ہنگامے بھی جاری ہیں اور وعظ و خطابت کے سلسلے بھی عروج پر ہیں، لیکن ان خدام دین کے

متعلق تحریری صورت میں معلومات فراہم کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی ۔ یہ نہایت افسوس ناک صورت حال ہے۔ معلومات فراہم کرنا اور انھیں تحریر کی سلک میں پرونا اسلام کے خلاف نہیں بلکہ عین اسلامی عمل ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے انبیا علیہم السلام کا تذکرہ کیا ہے۔ بلکہ اپنے دشمن اور نافرمان شیطان اور فرعون کے متعلق بھی معلومات بہم پہنچادی ہیں۔

نبی ﷺ نے اپنے حالات سے ہمیں مطلع فرمایا ہے۔ صحابہ کرام، ائمہ عظام اور صلحا و اتقیا کے واقعات کتابوں میں مرقوم ہیں اور خطبا و مقررین ان واقعات کو جلسوں اور مجلسوں میں بیان کرتے ہیں۔

یہ چند سطور اس لیے لکھی گئی ہیں کہ مولانا احمد الدین گکھڑوی خطیب بھی تھے، مناظر بھی تھے اور مدرس بھی تھے۔ لیکن ان کے حالات ضبطِ تحریر میں نہیں لائے گئے۔ یہ ایک الم ناک حادثہ ہے۔ بڑی مشکل سے ان کے حالات جمع کیے گئے ہیں جو خوانندگانِ محترم کی خدمت میں پیش کیے جارہے ہیں۔ موجودہ دور کے علما کو اپنے حالات محفوظ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔



چودھواں باب

مدرس کی حیثیت سے

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ مولانا احمد الدین نے تمام علوم متداولہ کی تحصیل ماہر اساتذہ سے کی۔ یہ علوم عربی اور فارسی دونوں زبانوں میں پڑھائے جاتے تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد خود بھی مولانا ممدوح نے بعض مقامات پر تدریس کی۔

فارسی اور عربی زبانوں میں گفتگو بھی وہ روانی سے کرتے تھے، گزشتہ سطور میں ان کے بھتیجے جناب مرزا محمد یونس صاحب کا ذکر ایک سے زیادہ مرتبہ آیا ہے۔ وہ مولانا کی فارسی زبان میں مہارت کے متعلق جناب محمد سلیم چنیوٹی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''فارسی زبان میں ان کی قدرت تو میں نے بارہا دیکھی۔ وہ اس طرح کہ ہمارے ایک ہمسائے تخی شاہ صاحب تھے۔ وہ مولانا کے تقریباً ہم عمر تھے اور عالم آدمی تھے۔ ان کی اکثر ملاقاتیں مولانا صاحب سے ہوتی رہتی تھیں، جن میں ان کا ذریعہ کلام فارسی زبان ہوتا تھا۔''

اس طرح عربی بولنے اور لکھنے میں بھی مولانا قدرت رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک مرزائی نے ان کو عربی میں مناظرہ کرنے کے لیے کہا تو فوراً تیار ہو گئے۔ فرمایا آؤ۔ عربی میں مناظرہ کرتے ہیں۔ میں تمھیں بھاگنے نہیں دوں گا۔ اردو، عربی، فارسی ہر زبان میں مناظرے کے لیے تیار ہوں اور ہر وقت تیار ہوں۔

ہمارے دوست حافظ ریاض احمد عاقب کئی سال سے مرکز ابن القاسم الاسلامی ملتان میں خدمت تدریس انجام دے رہے ہیں۔ تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ انھوں نے حضرت مولانا عبدالتواب ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات لکھے ہیں جو کتابی

صورت میں چھپ چکے ہیں۔ جماعت اہل حدیث کے رسائل و جرائد میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔

ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے 4۔جون 2010ء کے شمارے میں مولانا احمد الدین گکھڑوی کے متعلق انہی حافظ ریاض احمد عاقب کا ایک خط شائع ہوا ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں کہ حضرت سید بدیع الدین شاہ صاحب راشدی نے بیس سال کی عمر میں اپنی عربی تصنیف ''المرآۃ لطرق حدیث من کان لہ امام فقراۃ الامام لہ قراۃ'' مکمل کی تو اسے اس دور کے مختلف جلیل القدر علماء کی خدمت میں پیش کیا، جنھوں نے اس کتاب پر تقاریظ لکھیں۔ ان علماء میں حضرت شاہ صاحب کے بڑے بھائی علامہ سید محبّ اللہ شاہ راشدی سمیت مولانا ابوالقاسم بنارسی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا حافظ عبداللہ روپڑی، مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی، مولانا عبدالحق بہاول پوری مکی، مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، مولانا احمد الدین گکھڑوی اور مولانا عبدالرحیم پچھمی شامل ہیں۔ مولانا احمد الدین گکھڑوی نے اس پر حسب ذیل تقریظ لکھی۔

فانی رأیت بعض المواضع من الرسالة التی الفها السید بدیع الدین فوجدتها عجیبة التحقیق، مفیدة التدقیق. قدجمع طرق الحدیث الذی روی عن جابر وغیره، اعنی من کان له امام فقرأة الامام له قرأة، وذکر تضعیفها وعللها بالتفصیل وحققها کالبخاری والبیهقی بالدلیل.

(میں نے سید بدیع الدین شاہ صاحب کے رسالے کے بعض مقامات کو بہ غور دیکھا تو میں نے اس میں عجیب وغریب اور مفید تریں تحقیق پائی، جس میں (مؤلف نے) حدیث ''من کان له امام فقرأة الامام له قرأة'' کے تمام طرق کو جمع کر دیا ہے، جو حضرت جابر رضی اللہ عنہ اور دوسرے راویوں سے مروی ہے، اور انھوں نے حدیث کے ان طرق کی وجہ تضعیف و علل کو تفصیل سے ذکر کیا ہے، اور امام بخاری اور امام بیہقی کی طرح انھوں نے سب طرق کی مدلل تحقیق کی ہے۔)

عرض یہ کرنا مقصود ہے کہ مولانا احمد الدین گکھڑوی فارسی اور عربی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ان میں گفتگو پر بھی قادر تھے اور تحریر پر بھی۔

عربی اور فارسی پر ان کے عبور کی وجہ یہ ہے کہ کتبِ درسیہ انھوں نے انہماک اور محنت سے پڑھی تھیں۔ پھر بعض مدارس میں یہ کتابیں انھوں نے طلبا کو پڑھائی بھی تھیں۔ اگرچہ انھوں نے طویل عرصے تک کسی مدرسے میں تدریسی خدمت سرانجام نہیں دی، اسی طرح زیادہ مدت تک کہیں خطابت کا فریضہ بھی انجام نہیں دیا، ہر جگہ ان کی مدتِ خطابت مختصر رہی یا چند سالوں تک محدود۔ لیکن یہ واضح بات ہے کہ جس مسجد میں وہ خطبہ دیتے تھے، وہاں وہ اگلے خطبے تک آٹھ دن بے کار تو نہیں بیٹھے رہتے تھے، لازماً اس اثنا میں وہاں کسی دینی مدرسے میں یا اسی مسجد میں جس کے وہ خطیب تھے، طلبا کو درسی کتابیں پڑھاتے ہوں گے۔ کوئی عالم دین بھی ایسا نہیں جو درس وتدریس سے گریز کرتا ہو۔

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں عرض کیا گیا مولانا احمد الدین نے جب درسیات سے فراغت پائی تو خود ان کے شہر گکھڑ میں حافظ محمد یوسف صاحب کے والد نے اپنے خرچ سے مسجد تعمیر کرائی جو اہل حدیث کی وہاں پہلی مسجد تھی، اس میں پچیس تیس طالب علم تھے جو قرآن حفظ کرتے تھے اور دینیات کی تعلیم بھی حاصل کرتے تھے۔ اسی شہر میں حافظ محمد یوسف نے مولانا احمد الدین سے کسبِ علم کیا اور پھر وہ مشہور عالم دین و مبلغِ اسلام ہوئے۔ حافظ محمد یوسف کے علاوہ بھی لازماً ان سے تھوڑے بہت شائقین علم نے اخذِ علم کیا ہوگا۔ حافظ صاحب طبعاً دینی معاملات میں خاموش رہنے والے نہیں تھے۔ وہ ضرور چھوٹے بڑوں کو تحصیلِ علم کی ترغیب دیتے ہوں گے اور ان کی ترغیب سے متاثر ہو کر تھوڑی یا زیادہ تعداد میں طلبا نے مولانا احمد الدین سے حصولِ علم کیا ہوگا۔ وہاں جو اتنی تعداد میں لوگوں نے مسلکِ اہل حدیث قبول کیا اور اس مسلک کی ایک مسجد کے بعد کتنی ہی مسجدیں تعمیر ہوئیں، یہ انہی السابقون الاولون حضرات کی تبلیغ کا نتیجہ ہے۔

اگر مولانا احمد الدین نے کسی کو علم نہیں پڑھانا تھا تو خود کیوں پڑھا؟ بے شک تحصیل علم کے بعد انھوں نے آگے بھی پڑھایا اور پڑھانے کا آغاز اپنے شہر سے کیا۔ اگر چہ اس کی تفصیل کا پتا نہیں چلتا تاہم قرائن سے پتا چلتا ہے کہ وہاں کے طلبا میں حافظ محمد یوسف گکھڑوی اور بعض دیگر حضرات شامل ہوں گے۔

مولانا احمد الدین نے وزیر آباد میں حضرت حافظ عبدالمنان اور مولانا عمرالدین کی مسجد میں خطابت کا سلسلہ شروع کیا۔ وہاں بھی پہلے سے طلبا تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ مولانا احمد الدین نے وہاں بھی پہلے اساتذہ کی طرح تھوڑا یا زیادہ عرصہ طلبا کو پڑھایا ہوگا۔

پھر فیصل آباد کی جامع مسجد اہل حدیث (امین پور بازار) میں وہ خطیب مقرر ہوئے تو اس مسجد میں بھی دو چار یا اس سے زیادہ طالب علموں کو پڑھاتے رہے ہوں گے۔ بعض معاملات نفیاً یا اثباتاً واضح نہیں ہوتے، ان کا فیصلہ قرائن اور ماحول کی فضا سے کیا جاتا ہے۔

چند مہینے پیشتر حضرت مولانا محمد علی جانباز کے صاحب زادۂ گرامی قدر جناب مولانا عبدالحنان ایم اے کی ایک نہایت معلوماتی کتاب ''تذکرہ مساجد اہل حدیث سیالکوٹ'' شائع ہوئی ہے، اس سے پتا چلتا ہے کہ سیالکوٹ میں بھی مولانا احمد الدین کا سلسلہ درس جاری رہا۔ فاضل مصنف لکھتے ہیں:

سیالکوٹ کی ایک مسجد کا نام ''جامع مسجد اہل حدیث ڈپٹی باغ'' ہے۔ اس مسجد کا سنگِ بنیاد 1960ء میں وہاں کے دو مشہور علماے دین نے رکھا تھا، وہ تھے مولانا حافظ محمد شریف اور مولانا حکیم محمد صادق۔!

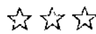
حافظ محمد شریف سیالکوٹ کے ممتاز عالم اور نامور خطیب تھے۔ ان کے ساتھی حکیم محمد صادق بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی تحریر میں بے حد شگفتگی اور دلکشی پائی جاتی ہے۔ عمدہ زبان اور قرآن و حدیث کے دلائل سے بھرپور اسلوبِ نگارش ان کی تحریر کا خاصہ ہے۔ چند اصحابِ ثروت کے تعاون سے یہ مسجد تکمیل کو پہنچی۔ اس میں پہلا خطبۂ جمعہ حکیم محمد

صادق صاحب نے ارشاد فرمایا اور پھر یہ خدمت انہی کے سپرد رہی۔

جس محلے میں یہ مسجد تعمیر ہوئی، اسے ''محلّہ ڈپٹی باغ'' کہا جاتا ہے۔اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ انگریزی حکومت کے زمانے میں سیالکوٹ کا کوئی انگریز افیسر کسی محکمے کا ڈپٹی تھا۔ یہ سارا علاقہ اس انگریز کی ملکیت تھا اور اس علاقے میں اس کا ایک باغ تھا جو کافی رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔اسے ''ڈپٹی باغ'' کہا جاتا تھا۔اب بھی یہ علاقہ اسی نام سے موسوم ہے۔

اس مسجد میں درس نظامی کی تعلیم کے لیے حافظ محمد شریف صاحب نے ''مدرسہ دارالحدیث'' قائم کیا، جس میں مولانا احمد الدین گکھڑوی اور حضرت مولانا عطاء اللہ لکھوی کے فرزند گرامی مولانا عبدالرحمٰن لکھوی کی خدمات بہ طور مدرس حاصل کی گئیں۔۔۔حافظ محمد شریف صاحب کی دعوت پر مولانا محمد علی جانباز سندِ فراغت حاصل کرنے کے بعد سیالکوٹ میں پہلی مرتبہ بہ طور استاذ اسی مسجد میں تشریف لائے اور یہاں دو سال درس حدیث دیتے رہے۔ پھر حالات نے ایسی کروٹ لی کہ وہ اسی شہر میں مستقل طور پر آباد ہو گئے اور جامعہ رحمانیہ کے نام سے ناصر روڈ پر دارالعلوم قائم کیا، اس عالمِ جلیل نے 13۔دسمبر 2008ء کو وفات پائی۔ان کی وفات کے بعد جامعہ رحمانیہ کا انتظام ان کے لائق فرزندوں کے ہاتھوں میں ہے۔وہ بڑی خوب صورتی سے اس جامعہ کو چلا رہے ہیں۔(1)

یہ معلوم نہ ہو سکا کہ مولانا احمد الدین گکھڑوی نے سیالکوٹ کے ''مدرسہ دارالحدیث'' میں کتنا عرصہ خدمتِ تدریس انجام دی۔



(1)۔ تفصیل کے ملاحظہ ہو! ''تذکرہ مساجدِ اہل حدیث سیالکوٹ'' صفحہ 322 تا 328۔از صاحب زادہ عبدالحنان جانباز ایم اے بن شیخ الحدیث مولانا محمد علی جانباز۔(طبع جولائی 2010ء)۔ناشر: ادارہ جامعہ رحمانیہ ناصر روڈ، سیالکوٹ۔

پندرھواں باب

اخلاق وعادات

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ مولانا احمد الدین تین بھائی تھے اور ایک بہن۔ بھائیوں میں سب سے بڑے احمد الدین تھے، ان سے چھوٹے فضل احمد اور سب سے چھوٹے عبداللہ۔!

مولانا احمد الدین کی شادی ہوئی، لیکن اس کے بعد معاملہ طلاق تک پہنچ گیا۔ پھر دوسری شادی نہیں کی۔ تمام عمر مجرد رہے۔ اولاد سے محروم تھے۔

☆ عبداللہ کی نرینہ اولاد چار بیٹے تھے، جن کے نام یہ ہیں: مرزا محمد یونس، محمد اسلم، محمد یعقوب اور محمد یوسف۔! مرزا محمد یونس نے بذریعہ ٹیلی فون بتایا کہ ان کے والد عبداللہ جوانی میں وفات پا گئے تھے۔ اس وقت ان کے بچے کم عمر تھے۔ ان (محمد یونس) کی عمر صرف دو سال کی تھی۔ آمدنی کا بہ ظاہر کوئی ذریعہ نہ تھا، لیکن مولانا احمد الدین نے ان بچوں کی اس طرح کفالت کی کہ انھیں مالی لحاظ سے کوئی پریشانی لاحق نہیں ہوئی۔ پھر بچے جوان ہو گئے اور اللہ تعالیٰ نے تکلیفیں رفع فرما دیں۔

ان بچوں نے بھی اپنے تایا مولانا احمد الدین کی بڑی خدمت کی اور ان کا ہر حکم مانا۔ اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ محمد اسلم کسی کام کے سلسلے میں ایک مرتبہ فیصل آباد جانے کے لیے تیار ہوئے تو مولانا احمد الدین نے فرمایا: میرے لیے زرعی یونیورسٹی کے مالی سے شہد کی بوتل ضرور لانا۔ وہ دس روپے کی بوتل دے گا۔ لیکن یہ وہاں اپنے کاموں میں ایسے الجھے کہ شہد کی بوتل والی مولانا کی بات بھول گئے اور واپس گکھڑ آ گئے۔ مولانا نے پوچھا: شہد لائے ہو؟ کہا: بھول گیا۔ لیکن اس بھول کا اس قدر احساس ہوا کہ دوبارہ فیصل آباد گئے اور شہد

کی بوتل لاکر مولانا کی خدمت میں پیش کی۔

عبداللہ کے چار بیٹوں میں سے دو بیٹے محمد اسلم اور محمد یوسف فوت ہو گئے ہیں۔ دو محمد یعقوب اور محمد یونس زندہ ہیں۔ محمد یونس کی عمر اس وقت ساٹھ سال ہے اور وہ کھوکھر کی (گوجراں والا) میں اقامت گزیں ہیں۔

مولانا احمد الدین سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ رہن سہن، لباس اور کھانے پینے میں کوئی تکلف نہ تھا۔ دوستوں کے دوست تھے۔ اشداء علی الکفار رحماء بینھم کا صحیح ترین نمونہ تھے۔ جو شخص ان پر کسی قسم کا احسان کرتا اسے یاد رکھتے اور اس کے شکر گزار ہوتے۔

☆ مولانا احمد الدین نے مروجہ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد 1920ء کے لگ بھگ تبلیغ دین کا سلسلہ شروع کیا۔ اس زمانے میں مبلغینِ اسلام زیادہ پیدل چلتے تھے، مولانا ممدوح بھی دیہات میں جلسوں پر جاتے تو پیدل ہی جاتے۔

☆ وہ بڑا عجیب دور تھا۔ لوگ اہل حدیث کی سخت مخالفت کرتے تھے۔ وہابی کہہ کر ان سے دور بھاگتے اور ان کے خلاف تعصب پھیلاتے۔ اس زمانے میں اہل حدیث علماء تبلیغِ دین کے لیے تکلیف اٹھا کر بھی پہنچنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ایک آدمی بھی ان کی تبلیغ سے راہِ راست پر آ گیا تو ان کا مقصد پورا ہو گیا اور ساری تکلیف رفع ہو گئی۔ یہ ان کے اخلاص اور کتاب وسنت سے محبت کی دلیل تھی۔

☆ مولانا احمد الدین نے تمام عمر توحید وسنت کی تبلیغ اور بدعات کی تردید کرتے ہوئے گزاری۔ یہی ان کی زندگی کا مقصد تھا اور یہی ان کے دل کی آواز تھی۔ اس سے انھیں راحت ہوتی تھی۔ اس سلسلے میں وہ کسی قسم کی مداہنت اور رورعایت کے قائل نہ تھے۔ نیکی اور برائی کے فرق کو جانچنے کا ان کا ایک خاص معیار تھا۔ کسی کو ذرہ بھی اس سے ہٹا ہوا دیکھتے تو فوراً اپنی رائے ظاہر کر دیتے۔ اس باب میں کسی بڑے چھوٹے اور عالم و غیر عالم کی پروا نہ کرتے۔ خطبہ جمعہ ایک ایسا معاملہ ہے کہ بعض خطیبوں کو اس کا احساس نہیں ہوتا کہ خطبہ مختصر

ہونا چاہیے یا لمبا۔ نہ اس مسئلے پر زیادہ غور کیا جاتا ہے کہ جمعے کی نماز میں اختصار سے کام لیا جائے یا نماز کسی قدر لمبی کی جائے۔ لیکن مولانا احمد الدین اس کا پورا خیال رکھتے تھے۔

☆ فیصل آباد کے ایک دوست نے بتایا کہ ایک دفعہ وہ مدرسہ دارالقرآن والحدیث (فیصل آباد) میں جمعہ پڑھنے گئے۔ شیخ الحدیث مولانا عبداللہ صاحب ویروالوی خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ وہ نہایت متبع سنت عالم دین تھے۔ شرعی احکام کے سلسلے میں بے حد محتاط۔ ان کا خطبہ کچھ لمبا ہو گیا۔ جمعے کے بعد مولانا احمد الدین نے اس پر انھیں ٹوکا اور فرمایا کہ خطبہ مختصر ہونا چاہیے۔ نمازیوں میں بیمار بھی ہوتے ہیں اور کمزور بھی، ان کا خیال رکھنا چاہیے۔ انھوں نے مولانا احمد الدین کو کوئی جواب نہیں دیا۔ کامل احترام کے ساتھ خاموشی سے ان کی بات سنی۔

☆ ایک دوست نے انھیں کھانے پر بلایا تو دیکھا کہ بیٹھک میں کسی کی تصویر لگی ہوئی ہے۔ فوراً پیچھے ہٹ گئے۔ فرمایا جب تک یہ تصویر نہیں ہٹائی جائے گی، میں آگے نہیں جاؤں گا، کھانا کھائے بغیر واپس چلا جاؤں گا۔ چنانچہ تصویر ہٹائی گئی تو آگے بڑھے اور کھانا کھایا۔

اس قسم کے معاملات میں وہ انتہائی حساس تھے۔ لیکن ہم ان باتوں کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ ہماری غلطی ہے۔ اس قسم کی غلطیوں کو معمولی نہیں سمجھنا چاہیے۔ ان کے ارتکاب سے بچنا چاہیے۔

☆ کسی عوامی جلسے میں اپنے کسی ساتھی مقرر کی تقریر میں کوئی ایسی بات سنتے جو لوگوں میں تو مشہور ہوتی، مگر شرعی اعتبار سے پایۂ ثبوت کو نہ پہنچتی تو اس مقرر کو اس کی غلطی کی طرف متوجہ فرماتے اور جلسۂ عام میں اس کی خود تردید کرتے یا مقرر سے کہتے کہ وہ اس غلط بیانی کی تردید کرے۔ اس ضمن میں ان کے اندازِ بیان میں بعض اوقات تشدد بھی آجاتا تھا۔

☆ وہ پسِ پشت کسی کی برائی نہ کرتے، اپنی زبان کو کسی کی غیبت سے آلودہ نہ ہونے دیتے۔ ان کے طرزِ بیان میں بعض مواقع پر سختی کا عنصر غالب آجاتا تھا، لیکن اس کا تعلق ان

کی حق گوئی سے تھا۔خواہ مخواہ کسی کو پریشان کرنا ان کا مطمحِ نظر نہیں ہوتا تھا۔

☆ وہ خوش خصال، صالح فطرت اور عمدہ سیرت عالم دین تھے۔ برائی کو برداشت کرنا اور برائی کا ارتکاب ہوتے ہوئے دیکھنا اور خاموش رہنا ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ صالحیت اسی کا نام ہے اور نیکی کے اصل آثار یہی ہیں۔ اس سے محرومی صالحیت سے محرومی ہے۔

سنا ہے کہ ان کے کسی قریبی عزیز کی شادی تھی۔ دیکھا کہ دولھا میاں نے سہرہ باندھا ہوا ہے۔فرمایا سہرہ اتار دو۔اس نے اتار دیا۔

پھر دیکھا کہ سر کے بالوں کی کٹنگ خلاف شرع ہے۔فرمایا بال کترا ؤ۔اس نے کتروا دیے۔

کسی کے ہاتھ میں چھوٹا سا ریڈیو تھا۔فرمایا اسے کہیں رکھ دو، اس نے رکھ دیا۔

بلاشبہ وہ گفتار میں، کردار میں اللہ کی برہان تھے۔خیر و صالحیت کا پیکر متحرک۔ مجسمۂ تبلیغِ دین۔ اخلاقِ حسنہ کے مالک۔ بہترین عادات کے حامل۔ خوش کردار۔ ہم عاجز بندوں کے نزدیک ان کی حسنات کا پلڑا بہت بھاری تھا۔ اگر انسانی فطرت کی رو سے کچھ لغزشیں ہوئیں بھی تو ان شاء اللہ حسنات کی کثرت سے ختم ہو گئیں۔قرآن مجید کا ارشاد ہے ان الحسنات یذھبن السیات۔نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں۔اور وہ کتاب وسنت کے سچے پیروکار تھے۔

☆ وعظ وتذکیر کے لیے وہ جہاں جاتے، حالات کے مطابق بات کرتے۔سختی کی ضرورت محسوس کرتے تو اسلوبِ کلام سخت ہو جاتا اور نرمی کی ضرورت ہوتی تو نرم انداز میں اپنا نقطۂ نظر بیان فرماتے۔ بے وجہ نہ سختی کا اظہار کرتے، نہ کسی کے لحاظ ملاحظے میں آ کر نرمی سے کام لیتے۔ان کا اصل مقصد اعلائے کلمۃ اللہ تھا، اور موقع و محل کی مناسبت سے اس پر عمل کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔وہ صحیح معنوں میں حق گو عالم دین تھے۔ لالچ، طمع، حرص، خوف سے

نا آشنا۔ احمد دین کو دینِ احمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بے پناہ محبت تھی۔ یہی ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا اور اسی کی ترویج و اشاعت ان کا شب و روز کا مشغلہ تھا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

اصل عادات و اخلاق وہی ہیں جو مولانا احمد الدین گکھڑوی میں پائے جاتے تھے۔ وہ نہ کسی کو پریشان کرتے تھے، نہ کسی کے درپے آزار ہوتے تھے، نہ کسی کو دھوکا دیتے تھے اور نہ کسی کا حق مارتے تھے۔ وہ نہایت صاف گو، علم پرور، اہل علم کی عزت کرنے والے، مہمانوں کی خدمت کرنے والے، کلمۂ حق بلند کرنے والے، عابد و زاہد، غیور اور جسور عالمِ دین تھے۔ اسلام کے صحیح مبلغ ان کی مجلسوں میں حاضر ہوتے اور ان سے استفادہ کرتے تھے، لیکن دینی مسائل کی غلط تعبیر کرنے اور احکام شریعت کو دینوی مفاد کے لیے استعمال کرنے والے ان سے خوف زدہ اور مرعوب رہتے تھے۔

غلط رو لوگوں کو وہ وعظ و تقریر میں ہدفِ تنقید ٹھہراتے اور عام مجالس میں ان کی سخت الفاظ میں تردید کرتے۔ اس سلسلے میں وہ کسی کی پروانہ کرتے۔ صحیح بات برسرِ عام بیان فرماتے۔

ہم عاجز بندوں کی دعا ہے کہ اللہ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کا ٹھکانا جنت الفردوس ہو۔



سولھواں باب

تصانیف

مولانا احمد الدین گکھڑوی جہاں کامیاب مناظر اور بہت اچھے خطیب ومقرر تھے، وہاں صاحبِ تحقیق مصنف بھی تھے۔ انھوں نے تصنیفی کام اگرچہ محدود پیمانے پر کیا اور زیادہ تر خدمات مناظر وخطیب کی حیثیت سے انجام دیں اور ان کی اصل شہرت کا باعث بھی یہی خدمات ہوئیں، تاہم ان کی محدود تصنیفی جدوجہد بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی تفصیل آئندہ صفحات میں دی جا رہی ہے۔

1۔ برہان الحق

مولانا احمد الدین کی تصانیف میں ایک قابلِ ذکر کتاب ''برہان الحق'' ہے۔ یہ کتاب پادری فنڈر کی کتاب ''میزان الحق'' کے حصۂ اول کے چار ابواب کا جواب ہے۔ پادری فنڈر عیسائیوں کے مشہور پادری تھے۔ مسلمانوں کی طرف سے قرآن مجید کی حفاظت کا شد ومد کے ساتھ جو دعویٰ محکم دلائل کی روشنی میں کیا جاتا ہے، پادری فنڈر نے میزان الحق میں اسے غلط قرار دیا ہے۔

مولانا احمد الدین نے اپنی کتاب برہان الحق میں پادری مذکور کے اس نقطۂ نظر کا نہایت وضاحت سے مدلل جواب دیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید بالکل محفوظ ہے۔ البتہ بائیبل میں تحریف وتبدل کا عمل جاری رہا ہے۔ اسے کسی صورت میں محفوظ اور اصلی بائیبل نہیں قرار دیا جا سکتا۔

مولانا احمد الدین کی یہ کتاب 16-30-20 سائز کے 192 صفحات اور 128

عنوانات پر مشتمل ہے جو بہت سال پیشتر سکول بک ڈپو، اردو بازار گوجراں والا کی طرف سے شائع کی گئی تھی۔

کتاب کے ابتدا میں مولانا ممدوح تحریر فرماتے ہیں:

''اکثر مسیحی دوست کہا کرتے ہیں کہ اہل اسلام ہماری کتابوں میں جو تحریف اور تغیرو تبدل ثابت کرتے ہیں، وہ درحقیقت نہ کسی قسم کی تحریف ہے، نہ تغیر و تبدل۔ وہ ترجمہ کرنے والوں کی غلطیاں ہیں۔ اصل کتابوں میں کمی بیشی کا نشان تک نہیں ہے۔

''ہم اُپنے ان دوستوں سے عرض کریں گے کہ کیا آپ کے پاس بائیبل کا کوئی اصلی نسخہ موجود ہے کہ اس نسخے کو معیار قرار دے کر موجودہ تراجم کا مقابلہ کیا جائے اور یہ بات کھل کر سامنے آجائے کہ واقعی اصلی بائیبل یہ ہے اور ترجمہ کرنے والوں نے اس میں تحریف کی ہے؟ لیکن ہم یہ دعوے سے کہتے ہیں کہ دنیا کے کسی عیسائی کے پاس بائیبل کا اصلی نسخہ موجود نہیں ہے۔ ان سب کے پاس تراجم ہی ہیں۔''

اس کے آگے مولانا لکھتے ہیں۔

''اگر اصل کتاب میں تغیر و تبدل نہ ہوتا تو مترجمین کی کیا جرأت کہ اس کے خلاف ترجمہ کریں۔ پس ثابت ہوا کہ بائیبل کے اصلی نسخے ہی میں تحریف اور تغیر و تبدل ہوا ہے۔

''پھر یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ ان تمام تراجم میں آخر کون سا ایسا ترجمہ ہے جو اصل کتاب کے موافق ہو؟ اگر ہے تو آپ پر لازم ہے کہ اس نسخے کا اعلان کریں۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ اصل اور صحیح نسخے کا اعلان کرنے کے بعد باقی تراجم کو غلط اور ساقط الاعتبار ہونے کی بنا پر چھوڑ دینے کا اعلان بھی کیا جائے۔

''یہاں یہ یاد رہے کہ رومن کیھتولک اور پروٹسٹنٹ دونوں فرقوں کی توراتوں میں مشرق اور مغرب کا فرق ہے، اور پھر ان دونوں کے علاوہ ایک تیسری تورات سامریہ کی ہے، جو ان دونوں توراتوں سے مختلف ہے۔ اب ان مسیحی دوستوں کو چاہیے کہ ان تینوں

میں سے ایک کا انتخاب کرلیں، باقی دو کو چھوڑ دیں۔ فرقے بھی تین ہیں اور ان کی کتابیں بھی تین ہیں۔ یہ تحریف کی ایک کھلی ہوئی علامت نہیں تو اور کیا ہے۔ لیکن یہ ان تینوں میں سے کسی کو بھی یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ کتاب صحیح ہے، اس لیے کہ کسی کتاب کے صحیح ہونے کے لیے دلائل کی ضرورت ہے، جو ان کے پاس نہیں ہیں۔

''اس تحقیق کے لیے پادری فنڈر صاحب کی کتاب ''میزان الحق'' کے چاروں ابواب کا بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا گیا، کیوں کہ ان ابواب میں پادری صاحب نے بائیبل کی حفاظت اور قرآن مجید کو تحریف شدہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان ابواب کا جواب اختصار کے ساتھ دیا جائے اور دے دیا گیا۔ ان کا جواب دینا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اکثر مسیحی دوستوں کا ماخذ یہی کتاب ہے۔ مسیحی مبلغین اسی کتاب سے مواد لے کر کتابیں شائع کرتے ہیں۔

''ہم نے اپنی اس کتاب (برہان الحق) میں اس بات کا خاص طور پر اہتمام کیا ہے کہ تحریفِ بائیبل کو خود اس کی اندرونی شہادتوں سے ثابت کیا جائے تاکہ ہمارے عیسائی دوستوں کو انکار کی گنجائش نہ رہے۔''

مولانا موصوف فرماتے ہیں:

''اس کتاب میں سب سے پہلے قرآن کے متعلق اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے، اور بعد میں بائیبل کی حقیقت واضح کی گئی ہے۔''(1)

حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب پر تقریظ لکھی ہے جو کتاب کے تین صفحات (187 تا 189) پر شائع ہوئی ہے۔ مولانا سلفی تحریر فرماتے ہیں:

''مولانا احمد الدین صاحب کی زیر تقریظ کتاب کو میں نے متعدد مقامات سے بغور پڑھا۔ مولانا نے تحریفِ انجیل کے متعلق مستقل دستاویز مرتب فرما دی ہے۔ مسیحی متکلمین

(1) برہان الحق صفحہ 12۔

تثلیث اور کفارہ ایسے مسائل پر جس زبان میں گفتگو کرتے ہیں، وہ انبیا کی زبان نہیں، وہ ارسطو اور افلاطون کے نظریات ہیں، جنھیں مسیحی متکلمین نے انجیل اور توریت کی تعلیمات میں ترمیم بلکہ تنسیخ کے لیے اس نہج پر مرتب کیا ہے، جس سے عوام کو مغالطہ دیا جا سکے۔"

مولانا سلفی اس سے آگے لکھتے ہیں:

"مولانا احمد الدین صاحب نے بائیبل کی سرگزشت کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور اس کی تحریف کے مختلف ادوار کا مفصل تذکرہ فرمایا ہے اور ثابت فرمایا ہے کہ موجودہ بائیبل میں لفظی اور معنوی تحریف دونوں موجود ہیں۔

"مسیحی مناظر اس موضوع سے عموماً پہلو بچا کر گزرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کبھی وہ تحریفِ قرآن کے موضوع اور تحقیقی ذخیرے کی آڑ لیتے ہیں، کبھی صحیح روایات کا مفہوم توڑ مروڑ کر مسلمانوں کو الزام دے کر بچنے کی سعی کرتے ہیں۔ معلوم ہے کہ الزام سے نہ کوئی جرم ثابت ہو سکتا ہے، نہ کوئی مجرم بری ہو سکتا ہے۔

"مولانا احمد الدین نے ان الزامات کا تحقیقی جواب دے کر مسیحی مصنفین کا تمام بقایا چکا دیا ہے۔ اب مسیحی مناظر جب تک بائیبل کا کوئی صحیح اور مستند نسخہ پیدا نہ کریں، جس پر تثلیث اور کفارہ ایسے غیر معقول اور خارج از فہم مسائل کی بنیاد رکھی جائے، اس وقت تک بات نہیں بن سکتی۔ مولانا احمد الدین صاحب نے تحریفِ بائیبل کے تمام پہلوؤں کا بہترین انداز سے جائزہ لیا ہے۔

"پہلے یہ ذخیرہ مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی رحمہ اللہ کی "اظہار الحق" اور ابن القیم کی "ھداھۃ الجباریٰ من الیھود و النصاریٰ" وغیرہ میں تھا، اب یہ مواد ایک خاص انداز سے زیرِ تقریظ کتاب میں آ گیا ہے۔ دونوں اس باب میں قابلِ اعتماد ہیں۔ خدا تعالیٰ مصنف کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ ناظرین سے استدعا ہے کہ کتاب غور سے پڑھیں اور اسے خرید کر مسیحی حضرات تک پہنچائیں، اور مصنف کی صحت اور طولِ حیات کے لیے دعا فرمائیں۔"

(محمد اسماعیل مدرس و خطیب جامع مسجد اہل حدیث۔ گوجرانوالا)

کتاب کے آخر (صفحہ 190، 191) میں کتاب کے ناشر عنایت اللہ نے ''عرضِ ناشر'' کے عنوان سے لکھا ہے:

''ناظرین! یہ کتاب جو کہ آپ کے ہاتھ میں ہے، اس کی اشاعت کی غرض و غایت سوا اس کے اور کوئی نہیں کہ عیسائیوں کے اکثر مناد اور پادری مختلف مقامات پر مجمعے لگا کر عیسائیت کی تبلیغ کرتے رہتے ہیں۔ اس وقت مسلمان اسے برا تو محسوس کرتے ہیں، لیکن عیسائیت کے متعلق کچھ واقفیت نہ ہونے کی بنا پر دل ہی دل میں جل کر رہ جاتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی مسلمان ان مجمع باز منادوں پر کوئی اعتراض کرے تو بجائے اس کے کہ اپنی بائیبل کی صفائی پیش کریں الٹا قرآن مجید اور اسلام پر برسنا شروع کر دیتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کمزور اعتقاد والے مسلمان اسلام سے بالکل انکار تو نہیں کرتے لیکن کچھ نہ کچھ شکوک و شبہات کو اپنے دل میں جگہ دے دیتے ہیں۔

''اس بات کو مدّ نظر رکھتے ہوئے میں نے حضرت مولانا کو اس پر آمادہ کیا کہ کوئی ایسی ایک کتاب ضرور لکھیں جو کہ ہر طبقے کے لیے یکساں مفید ہو۔ چنانچہ یہ کتاب اپنے فن میں ایک الگ حیثیت رکھتی ہے، جس کو پڑھ کر ایک معمولی علم والا بھی عیسائیوں کو لاجواب کر سکتا ہے۔

''پھر اس کتاب کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ پہلے ان اعتراضات کے جو کہ مخالفین قرآنِ پاک کی حفاظت پر کرتے ہیں، ٹھوس اور مدلل اور عام فہم جواب دیے گئے ہیں، اور ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن مجید نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آج تک ہر طرح کی کمی بیشی سے محفوظ ہے۔ بعد ازاں بائیبل کی خامیوں اور کمزوریوں کو اس کے اندر ہی سے مختلف طریقوں سے منظر عام پر لایا گیا ہے تا کہ مخالفین کو انکار کی گنجائش ہی نہ رہے۔''

(عنایت اللہ)

برہان الحق کے فاضل مصنف نے اپنے مقدمے میں اور مولانا محمد اسماعیل صاحب نے تقریظ میں اور ناشرِ کتاب عنایت اللہ نے ''عرض ناشر'' میں کتاب کی تصنیف و اشاعت

کی وجہ اور اس کے مندرجات کی تفصیل خوب صورت انداز میں بیان کر دی ہے۔ افسوس ہے، یہ تینوں بزرگانِ گرامی وفات پا چکے ہیں۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔

جناب عنایت اللہ صاحب جنھوں نے یہ کتاب مولانا سے لکھوائی اور پھر خاص طور سے اس کی اشاعت وطباعت کا اہتمام کیا، وہ مولانا ممدوح کے حقیقی بھانجے اور فائن کلاتھ ہاؤس گوجراں والا کے مالک تھے۔

برہان الحق اپنے موضوع کی ایک اہم کتاب ہے، جن حضرات کی تحریک وسعی سے یہ کتاب لکھی اور شائع کی گئی، اللہ انھیں اجرِ جزیل سے نوازے۔ اب اسے نظر ثانی کے بعد جدید انداز سے کمپوز کرا کے شائع کرنا چاہیے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ''برہان الحق'' کے چند اقتباسات بھی درج کر دیے جائیں تا کہ قارئین کو مولانا احمد الدین کے دعوے کے ثبوت میں ان کے دلائل کا پتا بھی چل جائے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ ان کی تحریری اردو زبان کتنی صاف اور سلیس ہے۔

''قرآن مجید کی حفاظت کے دلائل'' کے عنوان کے تحت مولانا ممدوح رقم طراز ہیں:

دلیل اول:

قرآن مجید بہ تدریج اتارا گیا۔ جتنا نازل ہوتا تھا، صحابہ کرام اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حفظ کر لیا کرتے تھے۔

دلیل دوم:

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پڑھنے کی یہاں تک فضیلت بیان فرمائی کہ ایک حرف کے بدلے میں دس نیکیوں کے ملنے کا وعدہ فرمایا اور اس کے بھلا دینے کی سخت مذمت کی (مشکوۃ باب فضائل القرآن) اس ترغیب اور ترہیب سے سیکڑوں صحابہ کرام نے قرآن مجید یاد کیا:

دلیل سوم:

پانچ وقت کی نمازوں میں سے فجر، مغرب اور عشاء تین نمازوں میں بلند آواز سے قرآن پڑھنے کا طریقہ جاری کیا۔ سورہ فاتحہ کے بعد امام مختار ہے کہ جہاں سے چاہے قرآن پڑھ سکتا ہے۔ پھر جن آیات کو امام پڑھتا ہے، مقتدیوں میں بعض ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں، جن کو سن کر وہ سورتیں یا آیتیں حفظ ہو جاتی ہیں۔ اگر امام ایک حرف کی غلطی بھی کرے تو فوراً مقتدیوں میں سے کوئی نہ کوئی وہی آیت صحیح الفاظ میں پڑھ کر سنا دیتا ہے تاکہ کتاب اللہ میں ایک حرف کی بھی غلطی نہ ہونے پائے۔ یہ طریقہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر تا حال اہل اسلام میں جاری ہے۔

دلیل چہارم:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حفاظتِ قرآن کی ایک عجیب تدبیر قائم کر دی۔ آپ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ دونوں کو حکم دیا کہ قیام رمضان کی گیارہ رکعات میں صحابہ کی بڑی جماعت کے امام بن کر رات کو قرآن سنائیں۔ (مشکوٰۃ باب قیام رمضان)

''پھر صحابہ میں سے سیکڑوں ایسے صحابہ تھے کہ جنھوں نے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن حفظ کیا تھا تاکہ کسی قسم کی کمی بیشی نہ ہونے پائے۔ چنانچہ اس زمانے سے لے کر تا حال یہی دستور جاری ہے کہ ماہِ رمضان میں تمام ملکوں کے ہر ضلعے، ہر شہر اور ہر قصبے میں سارا مہینا مسلمانوں کی بہت بڑی جماعت کو حافظ صاحبان امام بن کر بہ آوازِ بلند قرآن سناتے ہیں اور جماعت میں بھی کئی حافظ ہوتے ہیں۔ کیا مجال کہ امام ایک حرف یا زیر زبر کی بھی غلطی کرے۔

''پس خلاصہ یہ کہ سیکڑوں صحابہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی قرآن یاد کر لیا تھا اور صحابہ سے ان کے سیکڑوں شاگردوں نے اسی طرح قرآن یاد کیا جیسا کہ خود صحابہ نے نبی صلی

اللہ علیہ وسلم سے یاد کیا تھا۔ مسلسل اسی طرح ہر زمانے میں لاکھوں حفاظ، قرآن مجید یاد کرتے چلے آئے اور قیامت تک ان شاء اللہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔۔۔۔صحابہ میں سے اتنے حافظِ قرآن ہو گئے تھے کہ وہ ایک بڑے لشکر کی تعداد میں تھے، جو لڑائیوں میں بھیجے جاتے تھے۔

''جس کتاب کے حفظ کا یہ معجزانہ اہتمام کیا گیا ہو اور خاص قواعد وضوابط مقرر کیے گئے ہوں، اس میں کسی قسم کی ملاوٹ یا کمی بیشی کس طرح ہو سکتی ہے۔''(1)

اقتباس لمبا ہو گیا، لیکن اس کا اندراج نہایت ضروری تھا۔ یہ مضمون ایسا ہے جو مسلسل آنا چاہیے تھا۔ اس کے الگ الگ ٹکڑے نہیں ہو سکتے تھے، چنانچہ مسلسل ہی درج کیا گیا ہے۔

مولانا احمد الدین لکھتے ہیں:

''یہ حفظ قرآن کی سند کا مجمل ذکر ہے۔ دنیا بھر کا کوئی مذہب والا اپنی کتاب کی جسے وہ کلام اللہ سمجھتا ہے، اس طرح کی نظیر نہیں پیش کر سکتا۔ عیسائی زبان درازیاں تو بہت کرتے ہیں، لیکن وہ بائیبل کی کسی ایک کتاب کی ایسی سند نہیں پیش کر سکتے، جس طرح کہ ہم نے قرآن مجید کی سند پیش کی ہے۔''(2)

اس سے آگے مولانا ممدوح فرماتے ہیں کہ مختلف ملکوں اور علاقوں کے حفاظ قرآن کو اگر ایک مجلس میں بٹھا لیا جائے اور ان میں سے کوئی حافظ، قرآن کا کوئی حصہ پڑھے اور اس میں کوئی زیر زبر کی غلطی ہو جائے تو فوراً دوسرا حافظ اس غلطی کو پکڑ لے گا اور اس کی تصحیح کرا دے گا، لیکن بائیبل کے چند عالموں کو اسی قسم کی مجلس میں جمع کر دیا جائے اور ان سے کہا جائے کہ بائیبل کا کوئی حصہ زبانی سناؤ تو نہ ان میں سے کوئی سنا سکے گا اور نہ کوئی کسی کی تصحیح کر سکے گا۔

---

(1)۔ برہان الحق صفحہ 18 تا 20۔

(2)۔ برہان الحق صفحہ 21۔

قرآن کی سات قرأتوں کے متعلق جو اعتراض کیا جاتا ہے، اس کا جواب دیتے ہوئے مولانا احمد الدین تحریر فرماتے ہیں:

''حدیثوں میں جو یہ مذکور ہے کہ قرآن سات قرأتوں میں نازل ہوا ہے، محققین کے نزدیک ان سے الفاظِ قرآن میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہوتا، البتہ حرکات و سکنات وغیرہ اعراب میں قدرے تبدیلی آتی ہے۔ مثلاً ادغام، اظہار، امالہ، مد وغیرہ میں لغات عرب کچھ مختلف تھیں۔ کسی قبیلے کو زیادہ ادغام کی عادت تھی اور کسی کو اظہار کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر آسانی کی کہ سات قرأتوں میں سے وہ جس قرأت میں چاہیں پڑھیں۔''(1)

قرآن کی کیفیتِ نزول اور اس کی جمع و کتابت کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

''قرآن مجید نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک ایک سورت کر کے نازل ہوا، کبھی ایک آیت بھی نازل ہو جاتی تھی۔ جس قدر قرآن نازل ہوتا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ کو حفظ بھی کراتے اور لکھاتے بھی تھے۔(2)

مولانا لکھتے ہیں:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں قرآن مجید نازل ہو گیا تھا۔ موطا امام مالک کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں:

''نبی صلی اللہ علیہ سلم نے صحابہ کرام کو سفر میں قرآن اپنے ساتھ لے جانے سے منع فرمایا، اس خطرے کے پیش نظر کہ کوئی دشمن ان کے ہاتھوں سے چھین کر اس کی بے حرمتی نہ کرے۔''

مولانا فرماتے ہیں:

''اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں لکھا ہوا قرآن نہیں تھا یا صحابہ کے پاس قرآن نہ ہوتا تو آپ ایسا حکم کیوں دیتے؟ حفاظ کے دلوں سے نکال کر تو اس کی بے حرمتی

---

(1) برہان الحق صفحہ 38۔ (2) ایضاً صفحہ 40۔

کرنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

بے شک "برہان الحق" اپنے موضوع کی ایک اہم اور قابلِ مطالعہ کتاب ہے۔

2۔ سیرت سید العالمین

یہ کتاب 16-30-20 سائز کے 176 صفحات پر محیط ہے اور سکول بک ڈپو اردو بازار، گوجراں والا کی طرف سے شائع ہوئی، جو پادری ٹھاکر داس کی کتاب "سیرۃ المسیح ومحمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جواب میں لکھی گئی۔ ٹائیٹل پیج پر حسب ذیل الفاظ مرقوم ہیں۔

مصنفہ

مناظر اسلام مولانا احمد الدین گکھڑوی

رسالہ ہذا میں پادری ٹھاکر داس کے زہریلے حملے جو اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور عصمت پر کیے ہیں، ان کا جواب تحقیقی اور الزامی دے کر براہینِ قاطع بہ دلائل واضح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور عصمت کو ثابت کیا گیا ہے۔ ناظرین باتمکین کی خدمت میں التماس ہے کہ آپ اس رسالے کو اول سے آخر تک کم از کم دوبار ضرور پڑھیں۔ مسلم اسے پڑھ کر اپنے ایمان کو تازہ کریں اور مسیحی دوستوں پر اگر حق ظاہر ہو جائے تو اسے قبول کرنے میں ہرگز تاخیر نہ کریں۔"

یہ کتاب لکھنے کی وجہ مولانا احمد الدین گکھڑوی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"پادری ٹھاکر داس جی، ایل کا رسالہ "سیرۃ المسیح ومحمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) 1929ء میں اس عاجز کی نظر سے گزرا تھا۔ مصنف مذکور نے حضرت مسیح اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مقابلہ کرتے ہوئے حضرت سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ایسے ناشائستہ الفاظ استعمال کیے ہیں اور ایسا غیر مہذب انداز اختیار کیا ہے کہ اسے دیکھتے ہی مسلمان کا دل زخمی ہو جاتا ہے۔ ہمیں غیرت اسلامی اور چند احباب کی ترغیب نے اس کا جواب لکھ کر عیسائی مشنریوں میں ارسال کرنے پر اس لیے آمادہ کیا کہ شاید کوئی پادری

صاحب اس کا جواب شائع کر کے ہم تک پہنچا دے تا کہ اس کے جواب الجواب کی طرف توجہ کی جائے۔مگر تا حال کسی کو اس کا جواب لکھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔بعض احباب کی ترغیب نے دل میں خیال پیدا کیا کہ از سرِ نو اس میں کچھ ترمیم کر کے دوبارہ شائع کیا جائے۔"(1)

مولانا احمد الدین تحریر فرماتے ہیں:

"جواب لکھنے سے پہلے ہمارا عقیدہ جو انبیاء علیہم السلام کی نسبت ہے، بیان کر دینا ہم ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمارا اہل اسلام کا اعتقاد ہے کہ ہم تمام انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کو برحق مانتے ہیں۔ان کی تصدیق و احترام کو ہم صریح ایمان سمجھتے ہیں۔ناظرین اس بات کا ضرور خیال رکھیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی ہم برحق نبی اور رسول مانتے ہیں۔ان کی عزت بھی دوسرے رسولوں کی طرح کرتے ہیں۔ان کی توہین یا کسی دوسرے نبی کی توہین کو صریح کفر سمجھتے ہیں۔ ہمارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ ہم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو کل مخلوق بلکہ تمام انبیاء اور ملائکہ سے افضل و اشرف، سرورِ کائنات اور فخر موجودات، جامع کمالات وارفع الدرجات مانتے ہیں، جیسا کہ ہم نے اپنی کتاب "فضائل سید العالمین" میں ثابت کیا ہے۔"(2)

اس کتاب پر تین علمائے کرام نے تقاریظ لکھیں۔ان میں سے پہلے عالم دین ہیں مولانا احمد الدین کے اِستاذِ مکرم مولانا سلطان احمد سکنہ نت کلاں بمضافات گکھڑ۔دوسرے ہیں حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی اور تیسرے بزرگ ہیں حضرت سید محمد شریف شاہ صاحب گھڑیالوی کے فرزند گرامی حضرت سید محمد اسماعیل شاہ گھڑیالوی۔

---

(1) صفحہ 11۔مولانا کے ان الفاظ سے پتا چلتا ہے کہ کتاب کا یہ دوسرا ایڈیشن ہے۔ پہلا ایڈیشن 1930ء کے پس و پیش شائع ہوا ہوگا۔ پادری ٹھا کرداس کی کتاب کا انھیں 1929ء میں علم ہوا تھا اور اسی وقت اس کا جواب لکھ دیا تھا۔ یہ ایڈیشن جو اس وقت پیش نظر ہے اور جس میں پہلے ایڈیشن کی بہ نسبت کچھ اضافے کیے گئے ہیں، اگست 1966ء کا طبع شدہ ہے۔

(2) سیرت سید العالمین صفحہ 11۔

مولانا سلطان احمد تحریر فرماتے ہیں:

"اقول حامدًا و مصلیاً. برادرانِ اسلام۔ السلام علیکم۔ میرے شاگرد احمد الدین کو طالب علمی کے زمانے میں بھی غیر مذاہب کی کتب مطالعہ کرنے کا ازحد شوق تھا۔ اسی اثنا میں ان کو ایک رسالہ مسمی سیرت المسیح ومحمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ملا۔ اس کے مصنف پادری ٹھاکرداس نے حضرت مسیح اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مقابلہ کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں سب وشتم سے کام لیتے ہوئے افترا پردازی اور بہتان طرازی کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا۔ مولوی احمد الدین نے مجھے اس کے تحقیقی اور الزامی جواب سنائے جو نہایت مدلل اور مبرہن تھے، جن کو سن کر دل میں سرور پیدا ہوا۔ میں نے اس کو نصیحت کی کہ ان جوابات کو کتابی صورت میں قلم بند کر کے شائع کرنا چاہیے تاکہ اہل اسلام کے ہاتھ میں ایک دستاویز ہو۔ برادران اسلام کی خدمت میں التماس ہے کہ اس کتاب کی اشاعت میں نہایت کوشش کر کے بہ نظر غور مطالعہ کریں اور عیسائیوں تک پہنچانے کی سعی بھی کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی توفیق دے۔ آمین" (1)

اب حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی شیخ الحدیث والتفسیر گوجراں والا کی رقم فرمودہ تقریظ ملاحظہ ہو:

"الحمد لله رب العالمين و الصلوة والسلام على رسوله واصحابه اجمعين.

میں نے رسالہ "سیرت سید العالمین" کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ مولوی احمد الدین نے پادری ٹھاکرداس کے زہریلے حملے اور اعتراضات کا جواب دے کر اہل اسلام کو تسلی دے دی، بلکہ ان کے دل میں فرحت وسرور پیدا کر دیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کو براہین قاطع ودلائل واضح سے ثابت کر کے اہل اسلام پر احسان کیا۔ دعا ہے کہ

(1) سیرت سید العالمین صفحہ 172۔

اللہ تعالیٰ مصنف مذکور کو حضرت نوح علیہ السلام کی عمر اور صحت عطا کرے۔"(1)

تیسری تقریظ مولانا سید محمد اسماعیل شاہ بن حضرت سید محمد شریف شاہ گھڑیالوی کی تحریر کردہ ہے۔اس کا بھی مطالعہ فرمایئے:

"حامدًا ومصلیاً۔ برادران اسلام۔السلام علیکم۔میں نے لائل پور محلّہ مومن آباد میں قیام کیا اور مولوی احمد الدین نے مجھے مسودہ سیرت سید العالمین کا دکھایا۔ میں نے اس کا بہ نظر غور اول سے آخر تک مطالعہ کیا۔ مصنف نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو نہایت معقول ومنقول پرُ زور دلائل، تحقیقی جواب اور الزامی جواب سے مصنف مخالف کا ناطقہ بند کرتے ہوئے ثابت کیا ہے۔ بالخصوص اسلامی جہاد پر مخالف کے اعتراضات کا مدلل و مبرہن جواب دیا ہے۔

برادران اسلام کو اس رسالے کی اشاعت کی از حد سعی کر کے بہ نظر غور مطالعہ کرنا چاہیے اور اسے عیسائیوں کی مشنریوں تک پہنچانا چاہیے۔اللہ تعالیٰ اسلام کی خدمت کرنے کا زیادہ سے زیادہ اشتیاق پیدا کرے۔"(2)

جن حضرات کے تعاون سے یہ کتاب شائع ہوئی، مولانا احمد الدین صاحب "معاونین اشاعت کے حق میں دعا" کے عنوان سے ان کا ذکر مندرجہ ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:

"معاونین میں سے میرا حقیقی بھانجا عنایت اللہ سکنہ کھوکھر کے (متصل گوجراں والا) مولانا محمد رفیق صاحب پسروری، مولانا محمد رفیق صاحب مدن پوری لائل پور اور شیخ محمد اسحاق صاحب فتح گڑھی مہاجر حال وارد گوجراں والا وغیرھم ہیں، جنھوں نے مالی امداد سے اس کتاب کو شائع کرایا۔

"ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ان کے مال واولاد، صحت وعمر میں رحمت وبرکت کی بارش کرے اور ان کو کتبِ اسلامیہ کی (جو مخالفین کی تردید میں لکھی گئی ہیں) زیادہ

---

(1) ایضاً ص 173۔

(2) سیرت سید العالمین صفحہ 174۔

سے زیادہ اشاعت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔‘‘(1)

کتاب کے فاضل مصنف مولانا احمد الدین گکھڑوی، کتاب کے مخلص ترین ناشر حافظ محمد یوسف گکھڑوی اور کتاب کی طباعت میں مالی تعاون کرنے والے بزرگانِ گرامی (سب) وفات پا چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور انھیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

ان عالی مرتبت علمائے کرام کی تقاریظ کے بعد ہم اس کتاب کے متعلق کچھ عرض نہیں کرنا چاہتے۔ ان تقاریظ سے خوانندگانِ محترم پر یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ کتاب اپنے موضوع میں بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ البتہ یہ عرض کریں گے کہ کتاب میں پروف ریڈنگ کی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ اس کی افادیت کے پیش نظر اسے خوب صورت انداز سے کمپوز کرا کے دوبارہ چھپوانا چاہیے۔

3۔ تقدیس سید الابرار عن مطاعن الزنادقۃ والکفار:

مولانا احمد الدین گکھڑوی نے یہ کتاب بھی پادری ٹھاکر داس کی کتاب ’’سیرت المسیح ومحمد‘‘ کے جواب میں لکھی۔ قدرے بڑے سائز کے 47 صفحات کی یہ کتاب 1929ء میں تصنیف ہوئی۔ اپنے موضوع کی نہایت عمدہ کتاب ہے۔ پادری ٹھاکر داس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر جو اعتراضات کیے، کتاب میں ان کا تحقیقی اور الزامی دونوں طریق سے جواب دیا گیا ہے۔ پادری مذکور کے اعتراض کو ’’قال‘‘ لکھا گیا ہے اور اپنے جواب کو ’’اقول‘‘ تحریر کیا گیا ہے۔

کتاب پر نہ مقدمہ ہے، نہ کسی عالم دین کی تقریظ۔ یہ بھی مرقوم نہیں کہ کتاب کہاں چھپی اور کس ناشر نے شائع کی۔ ٹائیٹل پیج پر یہ الفاظ مرقوم ہیں:

---

(1)۔ سیرت سید العالمین صفحہ 175۔

هجوت محمدا فاجبت عنه وعندالله فی ذاک الجزاء

فان ابی ووالدتی و عرضی بعرضِ محمد منکم وفاء

الحمد لله که رساله لاجواب مسمی به

تقدیس سید الابرار

عن

مطاعن الذنا دقة والکفار

بجواب"سیرت المسیح والمحمد"

مصنفہ

مولوی احمد الدین صاحب متوطن گکھڑ۔ ضلع گوجراں والا

طبع ہوا 1929ء

4۔ نجات الاسلام

مولانا احمد الدین گکھڑوی کی یہ کتاب ساٹھ صفحات پر مشتمل ہے جو سکول بک ڈپو گوجراں والا نے 1961ء (1381ھ) میں شائع کی۔ اس کتاب کی تصنیف کا پس منظر یہ ہے کہ افغانستان کا ایک مسلمان سلطان محمد اس لیے عیسائی ہوگیا تھا کہ اس کے نزدیک اسلام میں نجات حاصل کرنے کی کوئی صورت نہیں، جب کہ عیسائیت میں نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ عیسائیت قبول کرنے کے بعد یہ شخص پادری ہوگیا اور اس نے اسلام کے خلاف کتابیں لکھیں، جس میں اسلام اور مسلمانوں پر شدید تنقید کی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اطہر و اقدس پر بھی سخت ترین حملے کیے۔ اس نے بعض مسلمان علما سے مناظرے بھی کیے۔ حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی سے بھی اس کے مناظرے ہوئے۔

اس کتاب پر حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی نے مقدمہ لکھا۔

آئندہ سطور میں پہلے مصنفِ کتاب مولانا احمد الدین کا دیباچہ درج کیا جارہا ہے، جس میں تالیفِ کتاب کی وجہ بیان کی گئی ہے۔ بعدازاں مولانا محمد اسماعیل سلفی کی تقریظ درج کی جائے گی۔

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدلله رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی محمد والہٖ واصحابه اجمعین برحمتک یاارحم الراحمین.''

مولانا احمدالدین فرماتے ہیں:

''عاجز احمدالدین جمیع برادران اسلام کی خدمت میں عرض پرداز ہے کہ ایک رسالہ مسمّٰی بہ ''میں مسیحی کیوں ہوگیا'' عاجز کی نظر سے گزرا جس کے مصنف جناب پادری سلطان محمد صاحب افغانستانی ہیں۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ میں اسلام کو چھوڑ کر اس لیے عیسائی ہوا کہ اسلام میں نجات نہیں پائی جاسکتی اور عیسائیت میں مجھے نجات مل گئی۔

''چند احباب نے اس کا جواب لکھنے کی مجھے ترغیب دی، جن میں خصوصاً مولوی محمد رفیق صاحب (محلّہ مدن پورہ لائل پور) شاعر اسلام جناب محمد سعید صاحب الفت، شیخ محمد اسحاق صاحب گوجراں والا اور جناب عنایت اللہ صاحب کھوکھر کی والے وغیرہ شامل ہیں۔

''اس رسالے کا جواب حضرت شیخ الاسلام جناب مولانا ثناء اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ (امرتسری) نے اخبار ''اہل حدیث'' میں قسط وار شائع کیا۔ (اخبار کے وہ شمارے مجھے دست یاب نہیں ہوئے) بعدازاں اس کا جواب الجواب پادری صاحب نے وہ آیات اور احادیث جن سے استدلال کرتے ہوئے اسلامی نجات کی نفی کی، بالتفصیل لکھ کر شائع کیا، اور اس کا نام ''شیر افگن'' رکھا۔ چوں کہ مولانا ثناء اللہ صاحبؒ کا لقب ''شیر پنجاب'' تھا، اس لیے پادری صاحب نے اپنے رسالے کا نام ''شیر افگن'' رکھا۔ گویا وہ شیر سے بھی زیادہ طاقت ور ہے۔

''اس عاجز نے جناب پادری صاحب کے ہر دو رسائل کو سامنے رکھ کر جواب دیا ہے۔

''ان کی طول کلامی اور غیر متعلقہ باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف ان کے دلائل کا ہی جواب دیا جاتا ہے۔

''جناب پادری صاحب کے رسائل کے اقتباسات کے لیے''سیآت'' کا لفظ تجویز کیا گیا ہے جس کا ترجمہ گنہگاری اور بدیاں ہیں۔یعنی جناب پادری صاحب کا مقصد یہ ہے کہ گنہگار انسانوں کو اسلام نجات نہیں دلا سکتا۔ چنانچہ پادری صاحب کے اعتراضات کے جواب کے لیے اسی نسبت سے''نجات'' کا لفظ اپنی طرف سے مناسب سمجھا گیا ہے، جس کے معنی مصیبت سے رہائی پانے کے ہیں۔

''نیز اس رسالے میں پادری صاحب کے رسالے''میں مسیحی کیوں ہوگیا'' کی علامت''میں۔۔۔گیا'' اور ان کے رسالے شیر افگن کی علامت''شیر'' بہ غرض اختصار اختیار کی گئی ہیں۔بعض مقامات پر مناسبت کے لحاظ سے ہر دو رسائل کا پورا نام بھی استعمال کیا گیا ہے۔

''پادری صاحب نے اپنے رسائل میں حضرت مولانا ثناءاللہؒ کے حق میں توہین آمیز الفاظ استعمال کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا۔ وہابی وہابی کی رٹ لگا کر بہت سے اوراق کو سیاہ کر دیا ہے۔ چوں کہ مولانا صاحب اہل اسلام میں ایک ممتاز ہستی رکھتے تھے، اس لیے ان کی توہین وتذلیل دیکھ کر اگرچہ ہمیں سخت صدمہ ہوا ہے، لیکن ہم پادری صاحب کو معاف کرتے ہیں۔اصل واقعہ یوں ہے کہ موضع قلعہ میہاں سنگھ (ضلع گوجراں والا) میں ایک مناظرہ ہوا۔ اہل اسلام کی طرف سے مولانا ثناء اللہ صاحب اور مولانا محمد ابراہیم صاحب میر سیالکوٹی مناظر تھے۔اور عیسائیوں کی طرف سے پادری عبدالحق صاحب ور پادری مذکور (سلطان محمد صاحب) تھے اور خاکسار بھی وہاں موجود تھا۔

''اسلامی نجات'' کے موضوع پر مولانا ثناءاللہؒ مدعی تھے اور پادری سلطان محمد صاحب معترض تھے۔''شیر پنجاب'' کی مدلل تقریر سن کر پادری صاحب پر ایسی وحشت ناک اور حیرت انگیز حالت طاری ہوئی کہ بولنے سے عاجز ہو گئے۔ان کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔

''علاوہ ازیں پادری صاحب نے عیسائیوں میں عالی مرتبہ حاصل کرنے کے لیے

اپنے اخبار میں قرآن مجید کی تفسیر لکھنی شروع کی، اور اس کا نام ''سلطان التفاسیر'' رکھا۔ شیر پنجاب مولانا ثناء اللہ نے اخبار ''اہل حدیث'' میں اس کا جواب دینا شروع کیا اور اس کا نام ''برھان التفاسیر'' رکھا۔ پہلے پارے کے چوتھے حصے تک پہنچ کر جناب پادری صاحب نے اپنے قلم کو نیچے ڈال دیا اور تفسیر کے سلسلے کو بند کرتے ہوئے عذر کیا کہ مجھے ''بواسیر'' کا عارضہ ہو گیا ہے، اس لیے میں تفسیر کو بند کرتا ہوں، چنانچہ مولانا موصوف نے اخبار میں شائع کیا کہ ناظرین اخبار ''اہل حدیث'' میں جو مسلسل طور پر ''برہان التفاسیر'' بجواب ''سلطان التفاسیر'' پڑھا کرتے تھے، وہ سلسلہ اب ختم ہو چکا ہے، کیوں کہ پادری صاحب کو بواسیر شروع ہو گئی۔ لہٰذا اب سے تفسیر نہیں آیا کرے گی، بلکہ اس کی بجائے بواسیر آیا کرے گی۔

''بہر کیف ہم ذاتیات میں الجھنے کی بجائے صرف دلائل کے جوابات تک ہی محدود رہنا مناسب سمجھتے ہیں۔''

احقر احمد الدین

اب پڑھیے مولانا محمد اسماعیل کی تقریظ۔

الحمد لله و كفى وسلام على عباده الذين اصطفىٰ

''عیسائیت اور اسلام میں آویزش بہت پرانی ہے۔ اس کے وجوہ مختلف رہے ہیں۔ معاشی، سیاسی، دینی، اخلاقی۔ اسلام نے ہر میدان میں مسیحیت سے مقابلہ کیا، دفاع بھی کیا، جارحانہ حملے بھی کیے۔ خود مسیحیت نے بھی اسلام کے ساتھ زور آزمائی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب عیسائیت کو موقع ملا، اس نے اسلام کو کبھی نہیں بخشا۔ عرصے تک یہ لڑائی اپنے اپنے حلقوں میں ہوتی رہی۔ علماء، اعتقاد اور اعمال میں مناظرات کرتے رہے، حکومتیں میدان کارزار میں اپنے جوہر دکھاتی رہیں۔ سیاسی، علمی، معاشی حلقے اپنے اپنے انداز سے اپنے اپنے مذہب کی خدمت کرتے رہے۔

''عرصے سے مغربی حکومتوں نے سیاسی مقاصد کے لیے مذہب کو استعمال کرنا شروع

کیا۔ معاشی رعایتوں سے مسیحیت کی اشاعت کے لیے راہیں ہموار کیں۔ چھوٹے اور غیر مستطیع ملکوں کو اس انداز سے امداد دی گئی کہ وہاں اگر سیاسی حربوں سے کام نہ چلے تو مشنریوں اور ان کے متعلقہ حلقوں کو سیاسی دسیسہ کاریوں کے لیے استعمال کیا جائے۔

''بعض کم فہم سیاست دانوں نے اپنی وسیع النظری کی ترنگ میں ملک میں ایسے عناصر پیدا کر لیے جن کی وفاداری ملک کے ساتھ قطعی طور پر مشکوک ہے۔

''وہ اس ملک میں رہتے ہوئے بھی دوسرے ملک کے وظیفہ خوار ہیں۔ یہ ہم وطن اجنبی اپنے ملک کے بجائے دوسرے ملکوں کی خدمت کرتے ہیں، اس لیے کہ انھیں کہیں سے وظیفہ درآمد ہوتا ہے۔

''مغربی طاقتیں اس عیسائیت کی اشاعت پر کروڑوں روپے خرچ کر رہی ہیں جس پر انھیں ذاتی طور پر کچھ یقین نہیں۔ ان کے محققین عہد جدید اور عہد عتیق دونوں کے صحیفوں کو وضعی اور غیر مستند سمجھتے ہیں۔ مگر ان کی اطاعت صرف اس لیے ہو رہی ہے کہ اس سے دوسرے ملک کے حالات معلوم ہوتے رہتے ہیں۔ نیز اس سے ملک کی سیاسیات میں دخل دینے کا موقع ملتا رہتا ہے۔ تعلیمی مشنریاں سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لیے کوشاں رہتی ہیں۔ تعلیمی ادارے علم کے ساتھ عیسائیت اور عیسائیت کے ساتھ اپنی سیاست کو کامیاب بنانے کا بہترین ذریعہ ہیں۔

''ہندوستان اور پاکستان میں انگریزی حکومت کے صد سالہ دور نے تعلیم کی راہ سے ایسی تباہی مچائی ہے کہ ہر پڑھا لکھا آدمی نیم بابو یا عیسائی معلوم ہوتا ہے۔ اسلام کے ہمدرد اور خیر اندیش حضرات کو ان تمام چور دروازوں پر نظر رکھنی چاہیے، اور انھیں بند کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

''عیسائیت کی روک تھام کے لیے محض مناظرات اور لٹریچر ہی کافی نہیں، بعض دوسری راہیں آج کل اس سے کہیں زیادہ مؤثر ہیں۔

''پادری سلطان محمد پال نے آج سے کئی سال پہلے ایک رسالہ لکھا تھا، جس میں ظاہر کیا تھا کہ انھیں اسلام میں چوں کہ نجات نظر نہ آئی، اس لیے وہ عیسائی ہو گئے۔ معمولی قسم کا طالب علم بھی سمجھتا ہے کہ وہ محض مغالطے تھے، جو نو آموز عیسائیوں کو خوش کرنے کے لیے لکھ دیے، ورنہ وہ حقیقت میں کچھ اور تھے۔ پادری صاحب زندہ ہوتے تو ہم ان سے عرض کرتے کہ ان کی اصل مصیبت آخرت نہیں، دنیوی نجات ہی تھی۔ مگر اب پادری صاحب کا انتقال ہو چکا ہے، اس لیے بحث بے وقت ہے۔

''ہمارے مولوی احمد الدین صاحب مخلص تریں اہل علم ہیں۔ وہ ایسے معاملات میں اپنا فرض ادا کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ انھوں نے پادری صاحب کی ان غلط بیانیوں کا پورا تعاقب کیا ہے کہ اگر کوئی شخص ان وجوہ سے ان کی طرف مائل ہوا ہو تو اس کی تسکین کا سامان ہو جائے۔

''سیاسی، معاشی، علمی راہوں سے آنے والی عیسائیت کا علاج ان لوگوں کا فرض ہے جو ان راہوں کے در و بست پر قابض ہیں۔

''اللہ تعالیٰ مولوی صاحب کو اجر اور توفیق عطا فرمائے تا کہ وہ دین کی مزید خدمت کر سکیں۔ کتاب آپ حضرات کے سامنے ہے۔ اس کے متعلق مجھے کسی تعارف کرانے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود اپنے متعلق سچا شاہد ہے۔''

محمد اسمٰعیل مدرس گوجراں والا

یکم محرم الحرام 1381ھ

15۔ جون 1961ء

5۔ قدامت اہل سنت والجماعت یعنی اہل حدیث

مولانا احمدالدین گکھڑوی کا یہ رسالہ 16۔30۔20 سائز کے 32 صفحات پر مشتمل ہے جوسکول بک ڈپو گوجراں والا نے جون 1968ء میں شائع کیا تھا۔ ''سخنے چند'' کے عنوان سے اس پر مقدمہ مولانا عبدالواحد مرحوم نے لکھا جو اس وقت جامع مسجد اہل حدیث توحید گنج گکھڑ کے خطیب وامام تھے۔

مولانا احمد الدین کا موقف یہ تھا کہ اہل حدیث ہی دراصل ''اہل سنت والجماعت'' ہیں جو صحیح معنوں میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اطاعت گزار اور عامل کتاب وسنت ہیں۔ اس مختصر رسالے میں انھوں نے بہ دلائل ثابت فرمایا ہے کہ یہی قدیم مذہب ہے، جس پر عمل پیرا ہونے کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم بھی اسی پر عامل تھے اور ائمہ اربعہ رحمہم اللہ بھی ہمیشہ اسی راہِ مستقیم پر گامزن رہے اور لوگوں کو اسی راستے پر چلنے کی تاکید فرمائی۔

اس رسالے میں مسئلہ تقلید پر بھی بحث کی گئی ہے اور ائمہ اربعہ (حضرت امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ) کے اقوال کے حوالوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ چاروں ائمہ نے کسی امام کی تقلید کرنے سے منع کیا ہے اور فرمایا ہے کہ صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر عمل کیا جائے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین کے مقابلے میں کسی کی بات کو قابلِ عمل اور لائقِ اتباع نہ سمجھا جائے۔

اپنے موضوع میں یہ رسالہ بہ درجہ غایت اہمیت رکھتا ہے۔ لیکن یہ چھوٹا سا رسالہ ایک ہی مرتبہ آج سے بیالیس (42) سال قبل (1968ء میں) چھپا تھا۔ وہ لتھو کی طباعت کا زمانہ تھا اور کتابیں لتھو پر شائع ہوتی تھیں۔ اُس دور کے مطابق رسالہ اچھے انداز سے چھپا۔ لیکن کوئی ناشر مولانا احمدالدین کا یہ رسالہ اور ان کی دوسری کتابیں کمپوز کرا کے خوب صورت انداز میں چھاپ دے تو یہ بڑی خدمت ہوگی۔

مولانا ممدوح کی تمام کتابیں حافظ محمد یوسف گکھڑوی مرحوم ومغفور نے اپنے ادارے سکول بک ڈپو گوجراں والا کی طرف سے شائع کی تھیں اور ان کی اشاعت میں محض مسلک اہل حدیث کی تبلیغ کا جذبہ کارفرما تھا۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر سے نوازے اور ان کی مغفرت فرمائے۔

یہ رسالہ مجھے میرے مرحوم کرم فرما حکیم عبدالمجید صاحب کے فرزندِ گرامی اور حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی کے بھتیجے حکیم محمد عتیق الرحمٰن صاحب (ساکن وزیرآباد) نے ارسال فرمایا۔ میں اس پر ان کا بے حد شکرگزار ہوں۔

6۔ فضائل سید العالمین:

مولانا احمد الدین گکھڑوی کی یہ تصنیف 16۔30۔20 سائز کے 240 صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے موضوع پر مشتمل ہے۔ اس کے صفحۂ اول (ٹائیٹل پیج) پر یہ الفاظ مرقوم ہیں۔

وکان فضل اللہ علیک عظیما فضائل سید العالمین

مصنفہ

احقر العباد احمد الدین گکھڑوی

ملنے کا پتہ:۔ دفتر سید العالمین گکھڑ منڈی

ناشر: سکول بک ڈپو۔ گوجراں والا

مولانا احمد الدین کی دوسری کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی حافظ محمد یوسف گکھڑوی کے سکول بک ڈپو گوجراں والا نے شائع کی اور اشرف پریس ایبک روڈ (لاہور) میں چھپی۔
یہ کتاب مجھے نہیں مل رہی تھی۔ میرے عزیز دوست شاہد فاروق ناگی (گوجراں والا) نے بذریعہ ڈاک ارسال کی۔ اس پر میں ان کا بے حد شکر گزار ہوں۔ شاہد فاروق ناگی کے متعلق میرا تجربہ ہے کہ میں نے جب ان سے کسی کتاب کے بارے میں کہا، اگر وہ ان کے پاس ہے تو انھوں نے فوراً بھجوادی۔ اگر نہیں ہے تو کہیں سے تلاش کر کے اصل کتاب یا اس کی فوٹو کاپی ارسال کردی۔ اللہ انھیں جزائے خیر سے نوازے۔

اس کتاب پر جن حضراتِ علماء نے تقاریظ لکھیں، وہ ہیں حضرت حافظ عبداللہ روپڑی، مولانا احمد الدین گکھڑوی کے استاذ محترم مولانا سلطان احمد موضع بنت کلاں، شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی اور مولانا محمد حنیف ندوی۔

ذیل میں سب سے پہلے تمہید پڑھیے جو خود مصنفِ ذی شان نے لکھی۔ یہ تمہید صفحہ تین، چار اور پانچ میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ یہ کتاب انھوں نے کیوں لکھی اور کس کے کہنے سے لکھی۔ اس کے بعد حضرت حافظ عبداللہ صاحب روپڑی کی تقریظ ہے۔ پھر مولانا سلطان احمد اور مولانا محمد اسماعیل سلفی کی تقریظیں اکٹھی ہیں اور تیسری تقریظ ہے مولانا محمد حنیف ندوی کی۔ ملاحظہ فرمایے پہلے حضرت مصنف کی تمہید۔ پھر ترتیب وار تینوں علمائے کرام کی تقاریظ۔

تمہید از مصنف

”الحمد للہ رب العالمین والصلوۃ والسلام علی افضل الانبیاء محمد و علی الہ و اصحابہ اجمعین.

”احقر العباد احمد دین گکھڑوی فضائل سید العالمین کو ہدیہ ناظرین کرتا ہے۔ اس کی تصنیف کا باعث یہ ہوا کہ مولوی عبدالسلام صاحب پونچھوی مقام سفیدہ والے تحصیل علم کے

لیے کچھ مدت میرے پاس ٹھہرے۔ جب اس سے فارغ ہو چکے تو کہنے لگے کہ ایک مضمون اس قسم کا قلم بند کرنا چاہیے جو وعظ میں بیان کیا جائے، جس سے سامعین کے دل میں لطافت ودلچسپی وحبِ رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم اور آپ ﷺ کی سنت کا اشتیاق پیدا ہو۔ پس حسب ارشاد ان کے نبی صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے فضائل کا مضمون تجویز کیا گیا، کہ نہایت عزیز اور دلکش ہے۔ پھر اس کے بعد حافظ محمد یوسف صاحب گکھڑوی مالک سکول بک ڈپو گوجراں والا نے دوبارہ اس کے لکھنے کی ترغیب دی اور اس کی اشاعت میں نہایت جاں فشانی سے کوشش بھی کی، خدا جزائے خیر دے۔ اس کو ترتیب دے کر دوبارہ لکھا گیا اور بعض مقامات میں ترمیم بھی کی گئی۔ رسالہ ہذا میں مندرجہ ذیل امور کا التزام کیا گیا ہے۔

''اول یہ کہ ان آیات واحادیث کا ذکر جو آپ ﷺ کی سیرت اور معجزات وغیرہ کے علاوہ ہیں (جو فضائل آپ ﷺ کے معجزات سے ثابت ہوتے ہیں) ان کا ذکر ہم نے اپنی کتاب برہان الحق میں کر دیا ہے۔ محبانِ رسول صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو ضرور اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

''دوم: حتی الامکان اس میں حدیث صحیح اور حسن پر ہی اکتفا کیا گیا ہے مگر بعض مقامات میں حدیثِ معروف کو جس میں خفیف سا ضعف ہے اور مضمون کے لحاظ سے احادیث صحیحہ کے عین مطابق ہے، اس کو بموجب اصول محدثین بطور استشہاد ومتابعت کے درج کیا گیا ہے۔

''سوم: فضائل پر سے شبہات کا ازالہ حتی الامکان تحقیقی جواب سے کیا گیا ہے۔ مگر بعض مقامات اس سے مستثنیٰ ہیں۔ الزامی جوابات سے اس لیے پرہیز کیا گیا ہے کہ یہ کوئی مخالفین کی تردید میں نہیں ہے۔

''چہارم: وہ فضائل جو روایات کاذبہ سے ثابت ہیں، ان سے یہ مضمون کلیتاً منزہ ومبرا ہے۔ کیوں کہ وہ درحقیقت فضائل نہیں، بلکہ وہ کاذبین کا اختراع اور خدا ورسول ﷺ پر

بہتان ہے۔بعض ان میں سے ایسے ہیں، جن میں عیسائیوں کی طرح غلو ومبالغہ پایا جاتا ہے اورقرآن وحدیث کے مخالف بھی ہیں۔اور غلو کا ذکر آئندہ کیا جائے گا،ان شاء اللہ۔

''پنجم: جس آیت سے فضیلت کا استدلال کیا گیا ہے، اس کو اس سے پیشتر کی آیت کے مضمون سے مناسبت اور ربط بھی دیا گیا ہے۔رسالہ ہذا کا نام فضائل سید العالمین رکھا گیا ہے۔''

تقریظ حضرت مولانا حافظ محمد عبداللہ صاحب روپڑی لاہور ماڈل ٹاؤن

''بسم لله الرحمن الرحیم الحمد لله رب العالمین و الصلوة و السلام علی سید العلمین

''فضائل سید العالمین'' مصنفہ مولانا احمد دین صاحب گکھڑوی میں نے شروع سے چالیس صفحات تک بالاستیعاب اور اس سے آگے کئی مقامات سے جستہ جستہ دیکھی۔اس موضوع پر آج تک بے شمار کتابیں شائع ہو چکی ہیں، مگر ''فضائل سید العالمین'' کے مصنف کا طرز بیان دلکش ہونے کے ساتھ عام فہم اور مناظرانہ ہے، فضائل کے بیان میں اسلام کی حقانیت اور عالم گیر ہونے کے زبردست دلائل ہیں۔مخالفین کے اعتراضات کا احسن طریق سے ازالہ کیا گیا ہے۔اس کتاب کی خاص خوبی یہ ہے کہ جس قدر فضائل بیان ہوئے ان کا ماخذ صحیح ہے اور ان کو بطور دعویٰ ودلیل کے بیان کیا ہے۔یعنی ایک فضیلت کا دعویٰ کر کے اس کو قرآن وحدیث سے ثابت کیا ہے۔مصنف نے روایات کی صحت کا التزام کیا ہے۔اگر کسی روایت میں کوئی ضعف ہے تو بہت تھوڑا اور ایسی روایات کا ذکر بھی اکثر بطور شواہد کے ہے۔مختصر یہ کہ اردو زبان میں یہ کتاب اپنے موضوع پر کئی خصوصیات کی حامل ہے، اس کا مطالعہ نہ صرف عوام کے لیے بلکہ علما خصوصاً مناظرین کے لیے بے حد مفید ہے۔اللہ تعالیٰ مصنف کو جزائے خیر دے اور ان کی سعی مشکور فرمائے۔اہل اسلام سے عموماً اور جماعت اہل حدیث سے خصوصاً میری سفارش ہے کہ اس کتاب کی اشاعت میں خاص حصہ لیں۔فقط عبداللہ امرتسری روپڑی، لاہور ماڈل ٹاؤن، کوٹھی نمبر 119، سی بلاک۔

تقریظ از شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل صاحب مدرس مدرسہ محمدیہ گوجراں والا

''فضائل سید العالمین'' کا کافی حصہ میں نے غور سے پڑھا۔محترم مصنف میرے دیرینہ دوست،مخلص اور نیک دل ہونے کے ساتھ تجربہ کار مناظر ہیں۔رسمی مناظرات میں ان کا ایک مخصوص مقام ہے۔

''ہمیں باوجودے کہ رسمی مناظرات سے کوئی دلچسپی نہیں، نہ ہی اس کے لیے طبیعت میں صلاحیت ہے، تاہم ''فضائل سید العالمین'' کو ہم نے دلچسپ پایا۔بعض مقامات میں تو مصنف علام نے بڑی دقت نظر سے کام لیا ہے، اور تحقیق مسئلے کی عام مناظرانہ روش پر غالب آگئی ہے۔بعض مقامات پر مناظرانہ انداز بھی نمایاں ہوگیا ہے۔لیکن اس کے باوجود سنجیدگی کا پہلو بہت واضح ہے۔

''مصنف محترم مبارک باد کے مستحق ہیں کہ ایک ایسا موضوع جس پر آج تک یا میلاد خوانوں کا قبضہ تھا، یا فلسفی سیرت نگاروں کا۔اول الذکر گروہ نے اس چشمۂ صافی کو اس قدر مکدر کر دیا کہ ایک سلجھا ہوا دماغ ان مزخرفات کو سن بھی نہیں سکتا، جو ان لوگوں کے وعظوں اور نعتوں میں بیان کیے جاتے ہیں۔

''دوسرے فریق نے اسے اس قدر خشک اور خاص فلسفی موضوع بنا دیا ہے کہ اس کے پڑھنے سے نہ تو عقیدت پیدا ہوتی ہے، نہ ہی وہ سرور باقی رہتا ہے، جو سیدِ عالم ﷺ کی سیرت کا لازمی جزو ہے۔

''مصنف علام نے اس رسالے میں علمی تحقیق کے ساتھ عقیدت مندی کے ذوق کو جمع کر دیا ہے۔ فجزاه الله عناو عن المسلمين. احسن الجزاء.

محمد اسماعیل بن ابراہیم السّلفی''

8/9/1950

مولانا سطان احمد کی تقریظ بھی اس سے ملتی جلتی ہے۔

تقریظ از حضرت مولانا محمد حنیف صاحب ندوی مدیر الاعتصام گوجراں والا۔

''فضائل سید العالمین'' کو میں نے جستہ جستہ کئی مقامات سے دیکھا ہے۔مولانا نے اس مفید کتاب کی تدوین میں جن امور کا التزام کیا ہے، اس میں وہ کامیاب ہیں، اس میں حشو و زواید سے قطعِ نظر صرف ان روایات و صحیح احادیث کا تذکرہ ہے، جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محامد کا کوئی پہلو نکلتا ہے۔کتاب بلاشبہ مفید اور قابلِ مطالعہ ہے۔''

(محمد حنیف ندوی)

7۔ تقریظ بر کتاب صلوۃ الرسول

مولانا حکیم محمد صادق سیالکوٹی مرحوم (متوفی 29۔جون 1986ء) بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔اسلوبِ تحریر نہایت شگفتہ۔اپنی تصانیف میں انھوں نے قرآن و حدیث کے مسائل کو جس خوب صورتی سے وضاحت کے ساتھ اردو زبان میں بیان کیا ہے، موجودہ دور کے دینیات پر لکھنے والے نوجوانوں کو اسے مشعلِ راہ بنانا چاہیے۔اللہ تعالیٰ نے ان کے قلم کو بڑی شگفتگی عطا فرمائی تھی، ان کا طرزِ نگارش ادیبانہ اور پُرکشش ہے۔ان کی تصانیف سے قاری کو جہاں مسائل شرعیہ سے آگاہی حاصل ہوتی ہے، وہاں نئے سے نئے ادبی الفاظ سے بھی اس کا ذہن آشنا ہوتا ہے۔

ان کی ایک کتاب کا نام ''صلوٰۃ الرسول'' ہے۔اس کے متعلق جن حضرات علمائے عظام نے قلمی صورت میں اظہارِ خیال فرمایا، ان میں حضرت العلام حافظ محمد گوندلوی، حضرت حافظ عبداللہ روپڑی، مولانا سید محمد داؤد غزنوی، مولانا محمد اسماعیل سلفی کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ان کے علاوہ مولانا احمد الدین گکھڑوی نے بھی اس کتاب کے بارے میں چند سطریں تحریر فرمائی ہیں، جو بڑی جان دار ہیں اور کتاب کے آغاز میں درج ہیں۔مولانا احمد الدین صاحب، حکیم صاحب کو تحریر فرماتے ہیں:

''آپ کی کتاب صلوٰۃ الرسول موصول ہوئی۔میں نے اس کے بعض مقامات عموماً اور اس کے مسائل اختلافیہ خصوصاً بہ غور مطالعہ کیے۔کتاب کو مستند اور مدلل پایا۔کتاب کی عبارت

اور اسلوبِ بیان بھی عجیب ہے۔ ہر مسلمان اردو خواں کو عموماً اور خصوصاً اہل سنت والجماعت اہل حدیث کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے، بلکہ دیہات کے علماء کو چاہیے کہ اس کتاب کو اپنے نصاب میں داخل کر کے چھوٹے بچوں کو ضرور پڑھائیں تا کہ ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی تعلیم حاصل ہو جائے اور وہ سب مسائل پر حاوی ہو جائیں۔ دھوالمطلوب۔

والسلام احمد الدین گکھڑوی (حال وارد، لائل پور 15۔ اگست 1969ء)''

یہ کتاب پہلی دفعہ 1969ء میں چھپی تھی۔ اس کے بعد کئی مرتبہ چھپی۔ بہت مقبول ہوئی اور بہت پڑھی گئی۔

اس کتاب کے بارے میں پاکستانی فوج کے ایک کرنل کا واقعہ سنیے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ان کا تعلق ایک بریلوی مسلک کے خاندان سے ہے۔ گھر کے تمام افراد پابندی سے نماز پڑھتے ہیں۔ لیکن میں نماز نہیں پڑھتا تھا۔ مجھے والدین نماز پڑھنے کے لیے کہتے تو میں خاموش رہتا۔ ایک دن مجھے خیال آیا کہ میں مسلمان ہوں اور فوج کے ایک بڑے عہدے پر فائز ہوں، مجھے اس پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور نماز پڑھنی چاہیے۔ لیکن نماز پڑھنے سے پہلے یہ معلوم کرنا چاہیے کہ نماز کیوں پڑھی جائے اور کس طریقے سے پڑھی جائے۔ میں اس سلسلے میں لائبریری گیا تو مجھے ایک کتاب ملی جس کا نام ''صلوٰۃ الرسول'' ہے۔ وہ کتاب زبان، انداز اور معلومات کے اعتبار سے میرے لیے بے حد باعثِ جاذبیت ثابت ہوئی اور میں اس سے اتنا متاثر ہوا کہ نماز کے تمام احکام اور اس کی ادائیگی کے سب طریقے میرے ذہن میں پیوست ہو گئے۔ پھر میں نے وہ کتاب خرید کر اپنے متعدد ساتھیوں کو دی اور انھوں نے اس کا مطالعہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو دوست نماز پڑھتے تھے وہ صحیح طریقے سے پڑھنے لگے اور جو نہیں پڑھتے تھے، وہ نماز کے پابند ہو گئے۔

اس کتاب کے بارے میں یہ ایک فوجی افسر کے تاثرات ہیں جو انھوں نے بیان کیے اور میں نے یہاں درج کر دیے۔

یادرکھیے!

اسلام کی تبلیغ جتنی ادبی اور خوب صورت زبان میں کی جائے گی، اتنی ہی پڑھنے اور سننے والوں کے لیے موثر اور فائدہ مند ثابت ہوگی۔

☆☆☆

سترھواں باب

واقعات ومعمولات کی ایک جھلک

(از مولانا محمد یوسف انور)

مولانا محمد یوسف انور کا شمار میرے سراپا خلوص دیرینہ دوستوں میں ہوتا ہے۔ وہ گزشتہ بیس برس سے جامع مسجد اہل حدیث (امین پور بازار فیصل آباد) کے منصبِ خطابت پر متمکن ہیں۔ ان کے والد محترم حاجی عبدالرحمٰن صاحب مرحوم جماعت اہل حدیث کے علماے کرام سے بے حد عقیدت ومحبت کا تعلق رکھتے تھے۔ وہ مسلک اہل حدیث کی تبلیغ میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔ بہت سے علماے کرام کی میزبانی اور اپنے مکان پر ٹھہرانے کا انھیں شرف حاصل رہا، جن میں مولانا احمد الدین گکھڑوی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ والدِ مکرم کی طرح مولانا محمد یوسف انور بھی علماے کرام کا انتہائی احترام کرتے اور ان سے قریبی مراسم رکھتے ہیں۔ مولانا احمد الدین کو چوں کہ انھوں نے بہت قریب سے دیکھا ہے اور چھوٹی عمر ہی سے ان کی مجلسوں میں بیٹھنے اور ان کی گفتگو سننے کے انھیں مواقع حاصل رہے ہیں، اس لیے انھوں نے میری درخواست پر مولانا ممدوح سے متعلق چند واقعات اور ان کے معمولات لکھ بھیجے ہیں، جنھیں انھی کے الفاظ میں ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔ مطالعہ فرمایے۔

☆ مولانا احمد دین گکھڑوی بلند پایہ عالمِ دین، بہت بڑے مناظر، تمام مذاہب کا گہرا مطالعہ رکھنے والے محقق اور مقرر تھے۔ تقسیم ملک سے کچھ عرصہ قبل ہمارے شہر پٹی (حال ضلع امرتسر) میں تین روزہ اہل حدیث کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ میں اپنے والد مرحوم

کے ساتھ کانفرنس میں گیا تھا۔ وہاں جن معروف علماء کی تقریریں سنیں اوران کی زیارت کی ان میں حضرت مولانا ثناءاللہ امرتسری کا اسم گرامی بالخصوص قابل ذکر ہے۔

کانفرنس کے ایک اجلاس میں مولانا احمد دین گکھڑوی نے پر جوش اور مدلل تقریر کی تو مولانا ثناءاللہ صاحب نے انھیں تھپکی دی اور فرمایا کہ میرے بعد مخالفین اسلام سے نپٹنے کے لیے اور میدانِ مناظرہ میں انھیں زیر کرنے کے لیے بحمد اللہ احمد دین موجود ہوگا۔ چنانچہ مولانا امرتسری کی بشارت کے مطابق ہی مولانا گکھڑوی کو دیکھا گیا بلکہ اس دور میں جہاں مولانا امرتسری کسی وجہ سے مناظرے کے لیے نہ جاسکتے تو مولانا گکھڑوی کو وہاں بھیجتے اور وہ مناظرہ کر کے فاتح کی حیثیت سے واپس لوٹتے۔

☆ مولانا گکھڑوی کی حاضر جوابی کا اس زمانے کا ایک واقعہ والد مرحوم نے ذکر کیا۔ پٹی سے تھوڑے فاصلے پر ایک دیہی مقام سُکھے تھا، جہاں بریلوی مناظر مولانا محمد عمر اچھروی سے مناظرہ طے تھا۔ امرتسر سے چلتے ہوئے پہلی ٹرین نکل گئی تو ہمارے مناظرین مولانا احمد الدین گکھڑوی، حافظ عبدالقادر روپڑی، مولانا محمد عبداللہ ثانی اور مولانا نور حسین گرجاکھی دوسری ٹرین پر سوار ہوئے۔ دوپہر کے وقت روانہ ہوکر ٹرین شام کو پٹی پہنچی اور پٹی سے تانگوں پر مقامِ مناظرہ میں یہ حضرات عشاء کے وقت پہنچے۔ والد صاحب بنفسِ نفیس وہاں موجود تھے۔ وہ بتاتے ہیں کہ جب مناظرہ شروع ہوا تو مولوی محمد عمر نے کہا کہ پہلے آپ اہل حدیث علما اپنی یہ پہلی شکست تسلیم کریں کہ مناظرے کا وقت 9 بجے تھا اور آپ لوگوں نے پورا دن ضائع کیا اور اب رات کو یہاں آگئے ہیں۔ کئی لوگ یہ کہہ کر چلے گئے کہ اہل حدیث نہیں پہنچ سکے۔ ان کی یہ تاخیر شکست کے مترادف ہے۔ بات کسی حد تک درست تھی۔ مگر فوری طور پر مولانا گکھڑوی کھڑے ہوئے اور کہا کہ مولوی محمد عمر اشتہار دیجیے۔ انھوں نے مناظرے کا اشتہار بھجوایا۔ اشتہار میں تاریخ اور وقت تو لکھا تھا مگر یہ نہیں لکھا تھا کہ صبح کے نو بجے یا رات کے نو بجے مناظرہ ہوگا، چنانچہ مولانا گکھڑوی نے مولانا محمد عمر سے کہا کہ جلسے

اور مناظرے اکثر رات کو ہوتے ہیں، ہم بروقت پہنچ گئے ہیں، یہ سمجھ کر کہ پروگرام رات کا ہے۔ اگر آپ کے مطابق دن کے 9 بجے کا وقت ہے تو بتایے دن کے 9 بجے کا وقت اشتہار میں کہاں لکھا ہے؟ اسی بات پر نعرے لگ گئے اور مولوی محمد عمر لا جواب ہو گئے۔

☆ تقسیم ملک کے بعد 1949ء کے آخر میں مولانا گکھڑوی فیصل آباد (اس دور کے لائل پور) تشریف لائے۔ قبل ازیں وہ وزیر آباد میں حافظ عبدالمنان رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد میں خطیب تھے۔ منتظمین نے مولانا کو فارغ کر کے مولانا محمد عبداللہ مظفر گڑھی کو خطیب مقرر کرلیا جو اچھے مقرر اور خوش الحان واعظ تھے۔ شاید انھیں مولانا کی گانے کے انداز سے خالی سادہ تقریر متاثر نہ کرتی ہوگی۔

☆ پاکستان بن جانے کے بعد جامع اہل حدیث امین پور بازار کے پہلے خطیب ہمارے استاذ مولانا محمد عبداللہ ویرووالوی تھے۔ مولانا عبداللہ صاحب عالی قدر مدرس تو تھے مگر ان کی خطابت سے لوگ مطمئن نہ تھے، جب کہ اس وقت جھنگ بازار میں مولانا سردار احمد بریلوی کا بڑا زور تھا اور شہر و مضافات میں بدعات پر مبنی مسائل پھیل رہے تھے۔ ایسے حالات میں میرے والد مرحوم نے جو انجمن اہل حدیث کے رکن بھی تھے، یہ بات انجمن کے اجلاس میں رکھی کہ مولانا احمد دین گکھڑوی کو لایا جائے۔ چنانچہ انجمن کے فیصلے پر والد صاحب وزیر آباد گئے اور مولانا کو لے آئے۔ 1950ء سے 1953ء کے غالباً آخر تک وہ جامع مسجد اہل حدیث امین پور بازار میں خطیب رہے۔ صبح کی نماز کے بعد وہ روزانہ درسِ قرآن مجید بھی دیتے۔ خطباتِ جمعہ کا مسلسل موضوع توحید رہا۔ درمیان میں رمضان، ذی الحجہ اور محرم کی مناسبت سے البتہ خطبات دیے جاتے تھے۔

☆ 1953ء کی تحریک تحفظ ختم نبوت میں فیصل آباد میں روزانہ جامع مسجد کچہری بازار میں صبح جلسہ ہوتا اور پانچ پانچ رضا کاروں کی گرفتاری دی جاتی۔ اس کے علاوہ بھی علماء ومقررین اور کارکنوں کی گرفتاریاں ہوتی تھیں۔ ایک روز مولانا گکھڑوی نے مرزائیت کے

خلاف اورختم نبوت کے اثبات میں زبردست تقریر کی۔ میں نے مولانا علی محمد صمصام کی نظم

دیکھومرزے قادیاں والے کہیاں پایاں بھنڈیاں

کئی قوماں دیاں قوماں کرگیا اے گندیاں

ترنم کے ساتھ پڑھی۔ میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ رات کو ہمارے مکان پر پولیس آئی۔ والد صاحب باہر آئے تو مجھے اور میرے والد اور مولانا گکھڑوی کو گرفتار کر کے لے گئی اور ڈسٹرکٹ جیل فیصل آباد میں بند کر دیا۔ دو ہفتے کے بعد مجھے اور والد صاحب کو تو چھوڑ دیا۔ لیکن مولانا احمد الدین گکھڑوی تین مہینے جیل میں قید رہے۔

☆ جب تک مولانا گکھڑوی امین پور بازار کی مسجد میں خطیب رہے، ان کا قیام وطعام ہمارے غریب خانے پر رہا۔ والد صاحب کو ان سے اور انھیں والد صاحب سے انتہائی محبت تھی۔ شہر اور مضافات میں جلسوں پر والد صاحب مولانا کو لے جاتے۔ چوں کہ مولانا کی بینائی کمزور تھی، اس لیے والد صاحب خاص طور پر ان کا خیال رکھتے۔ دن کے وقت اکثر مولانا مرحوم ہماری دکان گول بازار کریانہ پر والد صاحب کے پاس آجاتے، جہاں کاروبار کے ساتھ ساتھ مولانا سے میل جول کرنے والوں اور مسئلے مسائل پوچھنے والوں کا آنا جانا رہتا۔ مولانا گکھڑوی کے جگری دوست مولانا علی محمد صمصام تھے، جن کی رہائش فیصل آباد سے چند میل کے فاصلے پر چک نمبر 39 نزد ستیانہ بنگلہ تھی۔ وہ بھی تبلیغی پروگراموں میں آتے جاتے ہمارے غریب خانے پر قیام فرماتے۔ روپڑی برادران حافظ محمد اسماعیل اور حافظ عبدالقادر بھی پہلے والد صاحب سے آکر ملتے اور یہاں سے آگے جہاں شہر میں جانا ہوتا، جاتے تھے۔ جلسے سے فراغت کے بعد بھی ان کا قیام ہمارے ہاں ہوتا۔

☆ مولانا احمد الدین کے قیام کی وجہ سے دور دراز سے آنے والے علما کا قیام بھی ہمارے ہاں رہتا، جن میں مولانا عبدالمجید سوہدروی، حافظ محمد اسماعیل ذبیح، مولانا محمد رفیق خان پسروری، مولانا محمد عبداللہ گورداس پوری، مولانا سید عبدالغنی شاہ کاموں کی والے شامل

تھے۔ والد صاحب اور والدہ ان کی خدمت یعنی کھانے پینے کا پورا حق ادا کرتے اور بے حد عقیدت و احترام کے ساتھ ان کی ضروریات کا خیال رکھتے۔ یہ علماء رات گئے بھی تشریف لاتے تو میرے والدین کو ان کے اس وقت آنے پر بھی کوئی ملال نہ ہوتا بلکہ خوشی کا اظہار کرتے۔

☆ مولانا احمد الدین اپنے اساتذہ خصوصاً مولانا ثناء اللہ امرتسری (جو مناظرے میں ان کے استاد تھے) اور مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کا تذکرہ بڑے خوب صورت انداز میں کرتے۔ انھیں شیخین کے لفظ سے یاد فرماتے۔ مولانا گکھڑوی کی دعوت پر مولانا سیالکوٹی 1952ء میں فیصل آباد تشریف لائے۔ انھوں نے جامع اہل حدیث امین پور بازار میں خطبہ جمعہ ارشاد فرمایا۔ ان کا قیام صدر انجمن مولانا حکیم نور دین کی کوٹھی (کوتوالی روڈ پر جہاں حکیم صاحب کے صاحب زادے میر عبدالقیوم کی رہائش تھی) دو روز رہا۔

☆ ایک دفعہ مولانا گکھڑوی نے اپنے دوست اور تبلیغی ہم سفر مولانا نور حسین گرجاکھی کو بھی فیصل آباد آنے کی دعوت دی، چنانچہ انھوں نے بھی خطبہ جمعہ ارشاد فرمایا۔ رات کو سانگلہ ہل کے قریب ہنجلی گاؤں میں مولوی محمد عمر اچھروی اور مولوی عنایت اللہ سانگلوی سے مناظرہ طے تھا۔ یہ دونوں بریلوی عالم صبح سے شام تک دن بھر اہل حدیث کو مناظرے کے لیے للکارتے رہے۔ مگر جب شام کو مولانا گکھڑوی، مولانا نور حسین اور حافظ محمد اسماعیل روپڑی اور حافظ عبدالقادر وہاں پہنچے تو دونوں فوراً گاؤں چھوڑ گئے اور رات کو ان علماء نے تقریریں کیں۔ میں بھی والد صاحب کے ساتھ وہاں گیا تھا۔

☆ مولانا گکھڑوی نے ایک مرتبہ مرزائی مناظر سے شملہ میں مناظرہ کیا تھا۔ اس مناظرے کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ اس مناظرے میں ہمارے صدر مولانا عبدالمجید سوہدروی تھے اور دوسری جانب مرزائی مناظر سلیم تھا۔ طے پایا کہ وہاں کے ماحول کے مطابق اردو میں گفتگو اور تقریریں ہوں گی۔ مولانا فرماتے ہیں: ''میں چوں کہ اردو کے

بجائے پنجابی میں تقریر کرنے کا عادی ہوں، اس لیے اردو میں تقریر کرتے ہوئے کسی وقت پنجابی الفاظ زبان سے نکل جاتے جب کہ مرزائی مناظر فرفر اردو بول رہا تھا۔ اپنی زبان دانی کے گھمنڈ میں اس نے ہمارے صدر مولانا عبدالمجید سوہدروی سے کہا کہ آپ کو پنجاب سے کوئی ایسا مناظر نہیں ملا جو اردو بول سکے۔ آپ کا مناظر اردو بولتے بولتے بیچ میں پنجابی لے آتا ہے۔ بات تو اس کی درست تھی، مگر مولانا گکھڑوی نے جواب میں فرمایا کہ ''بھئی پنجاب کا خطہ ہی ایسا ہے، یہاں کے نبی کو اردو نہیں آتی تو ہماری کیا بات ہے۔ آپ کے مرزا غلام احمد نے فلاں کتاب کے فلاں صفحے پر ڈول کو بوکا لکھا ہے۔'' پھر مرزائی مقرر ایسا لاجواب ہوا کہ اس بات کو دوبارہ نہ دہرایا۔

☆ ایک شخص کو طلاق ثلاثہ کا مسئلہ سمجھاتے ہوئے کہا کہ اس کی مثال ایسی ہے کہ فجر کے وقت کوئی آدمی پانچوں نمازیں فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشاء اکھٹی ادا کرے۔ یہ نماز فجر کی ہوگی، باقی نمازیں اپنے اپنے وقت پر ہوں گی۔ اسی طرح تین طلاقیں ایک بار دینے سے ایک ہی واقع ہوگی۔ باقی اپنے وقت پر ایک ایک ماہ کے بعد واقع ہوں گی۔

☆ ایک گھر میں کھانے کی دعوت پر فرنی (سویٹ ڈش) کھاتے کھاتے مولانا ہنس پڑے۔ میں نے عرض کیا آپ ہنسے کس بات پر ہیں؟ فرمایا ''میں الہامی کھانا کھا رہا ہوں۔ مرزا غلام احمد کا الہام ہے کہ فرنی بڑی اچھی شے ہے۔''

☆ مولانا کو اہل سنت کے مکاتبِ فکر احناف (دیوبندی و بریلوی) اور شیعہ کے عقائد و اعمال اور ان کی فقہی کتب پر عبور حاصل تھا۔ تقریروں میں ان کے حوالے دیتے تھے۔ غیر مسلموں، عیسائیوں، مرزائیوں اور ہندوؤں کی کتب کے صفحاتِ ازبر تھے۔ ان کے ساتھ مناظروں کے واقعات بیان کیا کرتے تھے۔ میری عمر چوں کہ اس زمانے میں چھوٹی تھی اس لیے بہت سی باتیں حافظے میں نہیں رہیں۔

☆ جامع اہل حدیث امین پور بازار کی خطابت کے بعد قریباً دو سال تک مسجد مبارک

منٹگمری بازار میں خطبہ اور صبح کا درس قرآن ارشاد فرماتے رہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے امین پور بازار کی مسجد میں توحید بیان کی، یہاں رسالت بیان ہوگی۔ چنانچہ وہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور سیرت وسوانح ان کا موضوع رہا۔ شاید اسی دوران میں کتاب ''سیرت سید العالمین'' بھی تصنیف فرمائی۔

☆ منٹگمری بازار کے بعد گلبرگ (سی) کی مسجد الفردوس میں سال ڈیڑھ سال خطبہ دیتے رہے۔ پھر کئی سال جامع اہل حدیث مومن آباد میں خطیب رہے۔ یہاں مختلف عوارض کثرت بول، بخار اور اس کے ساتھ نقاہت اور کھانسی وغیرہ میں مبتلا ہوگئے۔ بالآخر اپنے آبائی شہر گکھڑ تشریف لے گئے اور وہاں انتقال کر گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

☆ مولانا احمد الدین نے قیام فیصل آباد کے دوران مولوی سردار احمد کو کئی بار مناظرے کا چیلنج دیا۔ مولانا سردار احمد کی مسجد (جھنگ بازار) میں مولوی محمد عمر اچھروی کی آمد ورفت رہتی تھی۔ مگر انھیں کبھی مولانا احمد الدین کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں ہوئی، البتہ تقسیم ملک سے قبل مولانا محمد عمر اچھروی سے ان کے کئی مناظرے ہوئے۔ اسی طرح دوسرے مسالک کے اہل علم اور غیر مسلموں سے بھی انھوں نے مناظرے کیے۔

☆ مولانا احمد الدین صاحب کے قیام فیصل آباد کے دوران مختلف مساجد میں ان کی خطابت اور وعظ کے سلسلے جاری رہے جن سے متاثر ہو کر بے شمار افراد بلکہ بہت سے خاندانوں نے مسلک اہل حدیث قبول کیا۔ ان میں صوفی احمد دین اور حاجی بشیر احمد اور ان کے بریلویت میں متشدد بھائی اور خاندان کے دور ونزدیک کے شیخ برادری کے لوگ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، جن کی اصلاحِ عقائد کے نتیجے میں شہر میں مسلک اہل حدیث کو بہت فروغ ہوا۔ اس سلسلے میں میرے والد علیہ الرحمۃ کا کردار بہت نمایاں تھا جو ان نوجوانوں کو کسی نہ کسی طرح مولانا کے پاس لے جاتے، ان سے یہ نوجوان مسائل دریافت کرتے۔ پھر جب وہ اپنے علماء کے پاس جا کر ان کا جواب طلب کرتے تو سمجھ جاتے کہ حق کیا ہے!

☆ 1955ء میں جامع اہل حدیث امین پور بازار میں مولانا محمد صدیق رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے۔ان کا طنطنہ اور جوش وجذبہ سونے پر سہاگہ تھا۔ان کی تاندلیاں والا میں اراضی،نمبرداری اور پھر گول بازار کریانہ میں ان کی دکان بھی تھی۔یہ قدرت کی طرف سے وہ اسباب تھے جن کی وجہ سے فیصل آباد شہر میں اہل حدیث کی ترقی ہوئی۔جامعہ سلفیہ، مدرسہ دارالقرآن والحدیث، جامعہ تعلیمات اسلامیہ اور چھوٹے بڑے کئی تعلیمی مراکز ومدارس اور شہر بھر کی نئی کالونیوں اور بستیوں میں مساجد اہل حدیث کی تعمیرات ہوئیں۔راقم السطور مولانا محمد صدیق کی رحلت کے بعد عرصہ بیس سال سے جامع اہل حدیث امین پور بازار میں خدمت خطابت انجام دے رہا ہے۔لیکن اس جماعتی ترقی کی اساس وبنیاد میں مولانا احمد دین گکھڑوی رحمۃ اللہ علیہ کی تگ وتاز اور مسلک اہل حدیث کی تبلیغ ودعوت کے سلسلے میں ان کی بھرپور شب وروز کی کوشش بھی شامل ہے۔اللھم اغفرلہ وارحمہ۔

☆ مولانا احمد الدین علیہ الرحمۃ شب زندہ دار اور تہجد گزار تھے،ہر وقت ان کی زبان ذکر واذکار میں مصروف رہتی۔ان کی خوراک بہت کم تھی۔ایک ڈیڑھ چپاتی سے زیادہ نہ کھاتے۔بادی اشیاء آلو اور گوبھی سے پرہیز کرتے،اگر کہیں کھانے میں یہ چیزیں ہوتیں تو پاؤ ڈیڑھ پاؤ دودھ منگوا لیتے اور اس سے روٹی کھالیتے۔سالن میں زیادہ مرچیں پسند نہ کرتے۔مرچ مصالحہ کے شدید مخالف تھے۔کہا کرتے تھے کہ ہندوؤں اور سکھوں میں بہت کم لوگ نابینا ہیں۔مسلمانوں میں نابیناؤں کی کثرت کی وجہ مرچ مصالحہ کا زیادہ استعمال ہے۔

☆ سادہ لباس،سفید تہبند،قمیص اور سفید پگڑی۔سرخ وسفید چہرہ،قد آور،گٹھا ہوا مضبوط جسم۔نوعمری میں لوہا بھی کوٹتے رہے تھے،اس لیے مضبوط اعصاب کے مالک تھے۔

☆ مسلک اہل حدیث اور اس کے امتیازی مسائل آمین،رفع الیدین،طلاق ثلاثہ اور مسنون تراویح گیارہ رکعت وغیرہ پر کوئی مداہنت نہیں کرتے تھے۔ان کے اثبات میں بڑے عقلی ونقلی دلائل بیان فرماتے۔بہت سے دیوبندی احباب نے اپنے علماء سے ان

مسائل کا جواب نہ پا کر مسلک اہل حدیث اختیار کیا۔ جلسوں اور کانفرنسوں میں ان کی تقریر اکثر مسلک اہل حدیث کی حقانیت کے موضوع پر ہوتی۔

☆ مولانا مودودی کے نظریات کے شدید مخالف تھے۔ مولانا عبدالواحدؒ مرحوم جو جامع اہل حدیث کے بانی اور امام تھے، مائل بہ جماعت اسلامی تھے۔ چنانچہ ان سے مولانا کی اکثر نوک جھونک رہتی۔

☆ مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف اس زمانے میں جماعت اسلامی کے ضلعی امیر تھے اور جماعت کا دفتر مسجد کے نیچے بازار میں تھا۔ حکیم صاحب مسجد میں نماز کے لیے آتے تو مولانا احمد الدین ان سے بھی مولانا مودودی کی تفسیری تشریحات اور اجتہادات کے متعلق گفتگو کرتے، جس کا شافی جواب حکیم صاحب سے نہ بن پڑتا۔ ایک مرتبہ مولانا مودودی کے فیصل آباد کے دورے کے دوران حکیم صاحب نے مودودی صاحب سے مولانا احمد الدین کی گفتگو اور تبادل خیالات کا پروگرام بنایا لیکن مولانا مودودی نے انکار کر دیا۔

☆ فجر کی نماز کے بعد درس قرآن دینے کے بعد کمپنی باغ سیر کے لیے جانا مولانا احمد الدین کا معمول تھا۔ بالعموم والد صاحب ان کے ہمراہ ہوتے، کبھی میں بھی ان کے ساتھ چلا جاتا۔ بعض اوقات دوسرے احباب بھی شریک ہو جاتے اور باغ میں محفل جم جاتی۔

☆ عام بات چیت اور دوستوں کی محفل میں وہ حاضر جواب اور خوش گفتار تھے۔ ان کے ایک عقیدت مند ڈاکٹر محمد یعقوب کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ انھوں نے نام کے بارے میں مولانا سے پوچھا تو برجستہ فرمایا یعقوب کا بیٹا یوسف۔

☆ جماعت میں مختلف گروہوں، مرکزی جمعیت اہل حدیث اور مرکزی جماعت اہل حدیث وغیرہ میں سے کسی کے باقاعدہ رکن نہیں تھے۔ مگر مرکزی جمعیت اہل حدیث کے نظام کو ترجیح دیتے، مولانا سید محمد داؤد غزنوی کی سیاست وعلمی بصیرت اور مولانا محمد اسماعیل

سلفی کی فہم وفراست اور محد ثانہ شان کے معترف تھے۔دونوں جماعتیں انھیں اپنے جلسوں اور کانفرنسوں میں مدعو کرتیں اور وہ خطاب فرماتے۔

☆ حضرت حافظ عبداللہ روپڑی کے علم وفضل، زہد وتقویٰ اور اندازِ فتاویٰ کی بڑی تعریف کرتے۔حضرت حافظ محمد گوندلوی کے طرزِ تدریس، وسعتِ مطالعہ اور علمی تحقیق کو سراہتے۔جب جامعہ سلفیہ کے ابتدائی زمانے میں کلاسیں جامع اہل حدیث امین پور بازار میں دو سال تک رہیں تو حضرت حافظ صاحب گوندلوی علیہ الرحمۃ کے درس بخاری میں با قاعدگی سے شمولیت کرتے اور سماعت فرماتے۔اسی طرح حضرت مولانا شریف اللہ خان جو حنفی المسلک تھے اور معقولات میں بلند مرتبہ رکھتے تھے، ان کے درس میں شامل ہوکر سلم اور مطول جیسی کتب کی سماعت کرتے۔عام طلبہ کے ساتھ بیٹھنے اور ان کے اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے میں کوئی عار محسوس نہ کرتے۔اساتذہ اور محنتی طلبا سے ان کا تبادل خیالات اور علمی مذاکرات رہتے۔

☆ امام جماعت غرباءِ اہل حدیث مولانا حافظ عبدالستار رحمۃ اللہ علیہ سے ایک مناظرے کا واقعہ جو غالباً پٹی یا مضافات میں ہوا، والد صاحب بیان کرتے ہیں کہ مولانا احمد دین نے امام صاحب سے مناظرے میں کہا کہ اگر آپ امام ہیں تو حدیں جاری کیوں نہیں کرتے؟ چور کا ہاتھ کاٹیں اور زانی اور شرابی پر حدود نافذ کریں۔امام صاحب نے جواب میں کہا کہ ہماری امامت ابھی مکی ہے۔جب اقتدار میں آئیں گے اور امامت مدنی صورت اختیار کرے گی تو حدود کا نفاذ کریں گے۔مولانا احمد الدین نے جواب میں کہا آپ کی امامت بڑی سیانی (عقل مند) ہے۔زکوٰۃ اکٹھی کرنے کے لیے مدنی ہے اور حدود جاری کرنے کے لیے مکی ہے۔اسی نکتے پر انھوں نے مناظرہ جیت لیا۔

☆ مولانا احمد دین صاحب کے زمانۂ خطابت امین پور بازار کے دوران ایک مرتبہ امام عبدالستار صاحب فیصل آباد تشریف لائے تو مولانا احمد الدین انتہائی محبت اور عقیدت

سے انھیں ملے۔ ہم نے دھوبی گھاٹ میں رات کو ان کی تقریر کا پروگرام بنایا، چنانچہ انھوں نے شرک و بدعات کی تردید اور توحیدِ باری تعالیٰ کے موضوع پر تقریر کی، ان سے قبل مولانا احمد دین اور مولانا علی محمد صمصام کی تقریریں ہوئیں۔ آخری تقریر دلپذیر حافظ محمد اسماعیل روپڑی کی تھی جن کی خطابت اور شیریں بیانی مثالی حیثیت رکھتی تھی۔

☆ بلاشبہ مولانا احمد الدین گکھڑوی اپنے عہد کے بہت بڑے مناظر اور حاضر جواب عالم تھے۔ ان کی مسلکی خدمات کی حدود بہت وسیع ہیں۔ وہ پُر جوش مقرر اور صاحبِ تحقیق مصنف تھے۔ ان کی تصانیف تعداد میں زیادہ نہیں ہیں، لیکن جتنی ہیں محققانہ انداز کی ہیں۔ اس قسم کے لوگ اب کہاں پیدا ہوں گے۔ اب حالات بھی بدل گئے ہیں اور لوگوں کی دلچسپیوں میں بھی تبدیلی آ گئی ہے۔



اٹھارھواں باب

مولانا گکھڑوی کے دس واقعات

(بہ قلم مولانا ارشاد الحق اثری)

مولانا ارشاد الحق اثری اردو اور عربی کی بہت سی کتابوں کے مصنف و مرتب اور جماعت اہل حدیث کے مشہور محقق اور خطیب ہیں۔ ادارہ علوم اثریہ (فیصل آباد) کی نظامت انہی کے سپرد ہے۔ اس ادارے میں متعدد اصحابِ علم تصنیفی خدمات سرانجام دے رہے ہیں اور ان کی تصانیف ہمارے لیے استفادے کا باعث ہیں۔ مولانا ممدوح سے طویل مدت سے میرے پُرخلوص دوستانہ مراسم قائم ہیں۔ ان کے حالات اور ان کی تصنیفی خدمات کی تفصیل میری زیرِ طبع کتاب ''گلستانِ حدیث'' میں مرقوم ہے۔ میرے اس عالم وفاضل دوست نے میری درخواست پر مولانا احمد الدین گکھڑوی سے متعلق دس دلچسپ واقعات ارسال فرمائے، جو کتاب کے ایک مستقل باب کے طور پر ذیل میں درج کیے جا رہے ہیں، ملاحظہ فرمایے۔

1۔ حضرت مولانا احمد الدین گکھڑوی مسلک اہل حدیث کے ترجمان اور فرق باطلہ عیسائیوں، قادیانیوں، آریہ سماجیوں، منکرین حدیث اور خرافاتیوں کے مقابلے میں سیف بے نیام اور کامیاب مناظر تھے۔ میرا ان سے پہلا تعارف 1964ء میں جامعہ تعلیم الاسلام ماموں کانجن میں ہوا۔ یہ میرا جامعہ سلفیہ (لائل پور) میں پہلا سال تھا۔ دوران سال وفات مسیح کے متعلق ایک پمفلٹ، جو آں جہانی مرزا غلام احمد قادیانی کے نام سے شائع ہوا تھا اور اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات کے متعلق تیس (30) آیات قرآنی سے استدلال

کیا گیا تھا، میرے ہاتھ لگا۔ اسے پڑھا تو دل و دماغ تشکیک کا شکار ہو گئے۔ ہم جماعت ساتھیوں سے بات ہوئی تو کوئی تشفی بخش جواب نہ ملا۔ اساتذہ کرام سے اپنی خورد سالی کی بنا پر بات کرنے سے گھبراتا تھا۔ میں تھوڑا عرصہ پیشتر جامعہ سلفیہ میں آیا تھا اور ابھی اہل حدیث بھی نہیں ہوا تھا۔ حسن اتفاق کہ جامعہ تعلیم الاسلام (ماموں کانجن) کے احباب نے کانفرنس کے انعقاد کا پروگرام بنایا۔ کانفرنس میں شرکت کے لیے ملک بھر کے جید اور نامور علمائے کرام کے نام پر مشتمل بڑا اشتہار پہلی بار دیکھا۔

ماموں کانجن کا نام عرصہ پہلے اپنے وطن لیاقت پور میں سن چکا تھا۔ اس کے دیکھنے اور کانفرنس میں شریک ہونے کا اشتیاق دوچند ہو گیا۔ ادھر میرے ہم جماعت مولانا حافظ عبدالستار مرحوم (سابق شیخ الحدیث جامعہ کوٹ ادو) اور مولانا عبدالکریم ثاقب (حال برمنگھم) حفظہ اللہ کی تشجیع نے اس اشتیاق کو سہ آتشہ بنا دیا کہ کانفرنس میں چلو، مولانا احمد الدین گکھڑوی وہاں تشریف فرما ہوں گے، ان سے حیات مسیح علیہ السلام کے مسئلے میں تمھاری تشفی ہو جائے گی۔ چنانچہ ہم حسب پروگرام کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے ماموں کانجن جامعہ تعلیم الاسلام پہنچے۔ وہاں پہلی بار اکابر علمائے اہل حدیث کو دیکھا، اور مولانا گکھڑوی تو ہمارے مطلوب تھے۔ وہ ایک خیمے میں تشریف فرما تھے اور ان کے چند عقیدت مندان کے پاس بیٹھے تھے۔ جامعہ سلفیہ کے ناتے سے ہم نے اپنا تعارف کرایا اور ان کے پاس بیٹھ گئے۔

حال احوال پوچھنے کے بعد مرحوم حافظ عبدالستار صاحب نے میرا تعارف کراتے ہوئے حیاتِ مسیح کے بارے میں مولانا مرحوم سے عرض کیا کہ یہ اس مسئلے میں تردد اور تشکیک کا شکار ہے اور قرآن پاک سے حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات پر جو مرزا قادیانی نے استدلال کیا ہے، اس کے بارے میں رہنمائی چاہتا ہے۔ چنانچہ مولانا مرحوم نے ان چند آیات کے متعلق گفتگو فرمائی جنھیں مرزا قادیانی نے معرض استدلال میں پیش کیا تھا۔ مولانا

کا اسلوب تفہیم مناظرانہ تھا۔ ایک راہ گم گشتہ کے لیے ظاہر ہے یہ اسلوب رہنمائی اور تشفی کا باعث نہیں بنتا۔ ایک طالب علم کی استعداد کے مطابق حکیمانہ گفتگو ہی اس کی تشفی کا باعث ہوتی ہے۔ انھوں نے طالب علم کا لحاظ رکھے بغیر اپنے مناظرانہ اسلوب کو ہی اپنائے رکھا۔ یوں ان کی باتیں میری سمجھ سے بالاتر رہیں اور میرے اشکالات بہ دستور ذہن کو پراگندہ کرتے رہے۔ اس کا حل بالآخر حضرت مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی رحمہ اللہ کی شہادت القرآن سے ہوا اور اطمینان قلب کی نعمت میسر آئی۔ والحمد للہ علی ذلک۔ یہ مولانا گکھڑوی سے میری پہلی ملاقات تھی۔

2۔ حضرت مولانا احمد الدین گکھڑوی رحمہ اللہ زندگی کے آخری ایام میں جب خطبہ وخطابت کے میدان سے اپنی ناتوانی اور پیرانہ سالی کی بنا پر فارغ تھے تو کچھ دنوں کے لیے ''لائل پور'' تشریف لے آتے۔ جامع مسجد رحمانیہ مندر گلی میں قیام فرماتے۔ مولانا محمد یوسف انور حفظہ اللہ کے والد گرامی حاجی عبدالرحمٰن مرحوم ان کے خدمت گزار ہوتے۔ اور اس خدمت میں رحمانیہ مسجد کے امام و مدرس حافظ محمد حنیف رحمہ اللہ بھی کسی اعتبار سے پیچھے نہیں رہتے تھے۔ وہ ان کی خوراک اور آرام کا بڑا اہتمام کرتے۔ حافظ محمد حنیف کا آبائی قصبہ فیروز وٹواں (ضلع شیخوپورہ) تھا۔ بڑے نیک اور درویش منش انسان تھے۔ رحمانیہ مسجد میں تشریف لانے والے علمائے کرام کی لوجہ اللہ خدمت کرتے اور خوش ہوتے۔ علمائے کرام بھی لائل پور تشریف لاتے تو رحمانیہ مسجد میں ڈیرے ڈال دیتے۔ مولانا احمد الدین بھی یہاں تشریف لاتے۔ احبابِ جماعت ان کی خدمت کرتے اور بیس پچیس دن بعد واپس تشریف لے جاتے۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ نقاہت و کمزوری کے باعث ان کا یوں آنے جانے کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

3۔ ایک بار یہ ناکارہ ان کی خدمت میں گکھڑ حاضر ہوا۔ گھر سے باہر سڑک کنارے چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ کچھ دیر ان کی خدمت میں بیٹھا رہا اور دعائیں لیتا رہا، علاج

معالجے کے لیے کچھ رقم ان کی خدمت میں پیش کی تو بڑی بے نیازی سے خاموشی کے ساتھ تکیے کے نیچے رکھ دی۔

4۔ مولانا مرحوم جامعہ رحمانیہ میں مختصر درس ارشاد فرماتے۔ راقم ان ایام میں ادارۂ علوم اثریہ منٹگمری بازار میں مقیم تھا۔ کبھی کبھی صبح کی نماز رحمانیہ مسجد میں ادا کرتا اور ان کے درس سے مستفید ہوتا۔ درس کے بعد مجلس میں حاضرین کے استفسارات کا جواب دیتے۔ اکثر و بیشتر قادیانیت، عیسائیت اور خرافاتیوں کے بارے میں گفتگو فرماتے۔ مرزا غلام احمد قادیانی کی کتابیں ہوں یا تورات و انجیل، حسبِ مناسبت ان کی عبارتیں پڑھتے تو یوں محسوس ہوتا کہ انھیں یہ کتابیں ازبر ہیں۔

5۔ ایک روز دوران گفتگو حیات مسیح علیہ السلام کے متعلق بحث چل نکلی تو انھوں نے فرمایا کہ امام بیہقی کتاب الاسماء والصفات میں ایک روایت لائے ہیں، جس میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کے آسمان سے نازل ہونے کا ذکر ہے۔ مجھے یہ کتاب نہیں مل سکی، ایک ثانوی حوالے میں یہ الفاظ میں نے دیکھے ہیں۔ میں نے عرض کیا حضرت ادارہ علومِ اثریہ کے کتب خانے میں امام بیہقی کی یہ کتاب موجود ہے اور اس میں واقعی یہ روایت ہے۔ میری بات سن کر خاموش ہو گئے۔ کچھ دیر بعد میں واپس ادارے میں آ گیا۔ دن کے تقریباً 9 بجے ہوں گے۔ میں اپنے کمرے میں جو اوپر کی منزل میں سیڑھیوں کے درمیان میں بنا ہوا تھا، لکھنے پڑھنے میں مصروف تھا کہ سیڑھیوں سے کسی کے آنے کا احساس ہوا۔ معاً خیال گزرا کہ کہیں مولانا احمد الدین ہی نہ ہوں، کیوں کہ سیڑھیوں پر چڑھنے کا ان کا خاص طریقہ تھا۔ نظر اور جسمانی کمزوری کے باعث وہ پہلے اپنا عصا سیڑھی پر مارتے۔ پھر اس پر قدم رکھتے۔ یوں ٹھک ٹھک کی آواز سے احساس ہوا کہ مولانا احمد الدین معلوم ہوتے ہیں۔ میں اٹھا تو میرا گمان یقین میں بدل گیا۔ انھیں تکیے کے ساتھ بٹھایا تو سانس لینے کے بعد فرمانے لگے، میں امام بیہقی کی کتاب الاسماء والصفات میں حوالہ دیکھنے کے لیے آیا ہوں، وہ حوالہ دکھاؤ۔

میں نے حیران ہو کر عرض کیا آپ نے اتنی زحمت کیوں فرمائی۔ مجھے کہہ دیا ہوتا، میں کتاب لے کر خود حاضر خدمت ہو جاتا۔ فرمانے لگے ضرورت میری تھی، تمھاری نہیں...... یہ ہے علم کی طلبِ صادق۔ اس پیرانہ سالی میں بھی یہ ذوق وشوق، ائمہ سلف کی میراث ہے۔ میں نے کتاب الاسماء والصفات کے علاوہ علامہ ہیثمی کی مجمع الزوائد سے بھی ''ینزل من السماء'' کے الفاظ دکھائے تو بڑے خوش ہوئے اور ڈھیروں دعائیں دیں۔

6۔ مولانا محمد یوسف انور نے ذکر کیا کہ مولانا احمد الدین مرحوم وزیر آباد میں محدثِ پنجاب مولانا حافظ عبدالمنان کی جامع مسجد میں خطیب تھے۔ اسی دوران ایک خطبہ وہاں مولانا عبداللہ مظفر گڑھی نے ارشاد فرمایا تو انتظامیہ کا مزاج بدل گیا۔ وہ بڑے خوش الحان اور مقبول خطیب تھے۔

مولانا احمد الدین علم وفضل کا سمندر تھے۔ استنباط مسائل میں اجتہادی ملکہ رکھتے تھے اور بڑے حاضر جواب مناظر اور اپنے مدِّ مقابل کو ہر پہلو میں مسکت جواب دیتے تھے۔ مگر ترنم اور خوش الحانی ان کی لغت سے خارج تھی۔ اپنی تمام تر خوبیوں کے باوصف اس ''کم زوری'' کے باعث ایک جگہ مستقل طور پر ٹھہر نہ سکے۔

7۔ وزیر آباد سے لائل پور تشریف لائے۔ یہاں جامع مسجد اہل حدیث امین پور بازار میں 1952ء یا 1953ء میں خطیب مقرر ہوئے اور اڑھائی تین سال یہاں خطبہ ارشاد فرماتے رہے۔ خودداری اور طبیعت کی بے پروائی کی بنا پر انتظامیہ سے اختلاف ہوا تو منٹگمری بازار کی جامع مسجد مبارک اہل حدیث کے احباب انھیں اپنے ہاں لے آئے۔ مولانا مرحوم نے فرمایا کہ اڑھائی تین سال میں نے امین پور بازار کی مسجد میں لا الٰہ الا اللہ کی تفسیر اور تبلیغ کی ہے، اب یہاں محمد رسول اللہ کی تفسیر بیان کروں گا۔ یہاں تقریباً دو سال رہے۔ مولانا محمد یعقوب مالک شافی دواخانہ مسجد کے صدر تھے۔ ان سے اختلاف ہوا تو مبارک مسجد کو بھی خیرباد کہہ دیا۔ اس کے بعد لائل پور کے محلّہ مومن آباد کے احباب، جن میں پیش

پیش مولانا محمد یحیی صاحب مرحوم تھے، انھیں اپنے محلے کی مسجد میں لے آئے اور تقریباً سات سال وہاں خطبہ ارشاد فرماتے رہے۔ مولانا گکھڑوی مرحوم کی تصانیف میں ایک کتاب ''سیرت سید العالمین'' صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اس کتاب کی تکمیل انھوں نے غالبًا اسی محلے (مومن آباد) میں کی جیسا کہ اس کی تقریظ میں حضرت مولانا سید محمد اسماعیل بن حضرت سید محمد شریف گھڑیالوی کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے۔

8۔ لائل پور کی ان مساجد کے علاوہ مولانا مرحوم نے گلبرگ کی جامع مسجد فردوس اہل حدیث میں بھی تقریباً ڈیڑھ سال تک خطبہ جمعہ ارشاد فرمایا۔ یہ کالونی نئی نئی بنی تھی اور اس سے آگے کوئی آبادی نہ تھی۔ مولانا صبح کی نماز کے بعد وہاں درس ارشاد فرماتے اور طلوعِ آفتاب کے بعد پیدل چل کر مولانا محمد یوسف انور کے والد گرامی حاجی عبدالرحمٰن کے ہاں آجاتے۔ حاجی عبدالرحمٰن کو اہل علم سے بڑا پیار تھا۔ وہ ان کی خدمت و مدارات میں سب سے زیادہ پیش پیش رہتے تھے۔ وہ معروف معنوں میں تو عالم نہ تھے مگر اپنے اخلاص اور عمل کی بدولت خاموش مبلغ اور داعی حق تھے۔ بہت سے حضرات کو ان کی دعوت سے توحید و سنت کی راہِ ہدایت ملی۔ علمائے کرام لائل پور میں تشریف لاتے تو ان کی مہمان نوازی میں کوئی کمی باقی نہ رہنے دیتے۔ مولانا احمد الدین بھی دن بھر ان کے پاس رہتے اور فرماتے کہ گلبرگ میں دل نہیں لگتا۔ اس سے آگے تو انسان نظر نہیں آتے۔ شام ہوتی تو پیدل واپس گلبرگ تشریف لے جاتے۔

9۔ حضرت مولانا حافظ عبدالقادر روپڑی مرحوم نے بتایا کہ حضرت مولانا علی محمد صمصام مرحوم نے گھر میں ایک بکری پال رکھی تھی، اس لیے مولانا احمد الدین انھیں مزاحاً ''بکری والا'' کہا کرتے تھے۔ مولانا صمصام نے ایک بار حضرت حافظ عبداللہ محدث روپڑی کی خدمت میں ان کی شکایت کر دی کہ یہ مجھے جلسوں میں ''بکری والا'' کہتے ہیں۔ حضرت حافظ صاحب نے یہ الفاظ کہنے سے مولانا احمد الدین کو حکماً روک دیا۔ تاہم وہ یہ

عرض کیے بغیر نہ رہ سکے کہ حضرت! آپ نے روک دیا تو میں یہ الفاظ آئندہ نہیں کہوں گا مگر اللہ کے نبی حضرت یونس علیہ السلام کو اگر مچھلی والا کہا جا سکتا ہے اور کہا گیا ہے (1) تو انھیں بکری والا کیوں نہیں کہا جا سکتا، جب کہ واقعتاً یہ بکری والے ہیں۔

10۔ مندر گلی کی جامع مسجد رحمانیہ ہی میں ایک بار یوں ہوا کہ رمضان المبارک میں عصر کے قریب چند حضرات بیٹھے تھے، مختلف مسائل پر گفتگو ہو رہی تھی کہ اس دوران مولانا علی محمد صمصام نے فرمایا جو شخص اب روزہ افطار کرے، میں اسے سو روپیہ دوں

(1)۔ سورہ الانبیاء کی آیت نمبر 87 میں حضرت یونس علیہ السلام کو ''ذاالنون'' (مچھلی والا) فرمایا گیا ہے، اس لیے کہ وہ تین دن مچھلی کے پیٹ میں رہے تھے۔

مولانا گکھڑوی بھی تشریف فرما تھے۔ فرمانے لگے: سو روپیہ دو، میں افطار کرتا ہوں۔ مولانا صمصام نے سو روپے دیئے تو جیب میں ڈال کر خاموش ہو رہے۔ مولانا صمصام نے اصرار کیا کہ روزہ افطار کرو۔ مولانا گکھڑوی فرمانے لگے کن نادانوں سے سابقہ پڑا ہے۔ بھائی روزہ افطار کرنے اور توڑنے میں فرق ہے۔ آپ نے افطار کا کہا ہے۔ افطار تو افطار کے وقت پر ہوگا۔ ان سے کہا گیا کہ بات تو اب افطار کرنے کی تھی۔ فرمانے لگے قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ''فالٰئن باشروھن'' (اب ان سے مباشرت کرو۔) ''اب'' سے رات مراد ہے۔ یعنی رات کے وقت اسی طرح اس ''اب'' سے بھی افطار کا وقت مقررہ مراد ہے۔

مولانا کے اس استدلال پر سب ششدر ہو کر رہ گئے۔ اس سے ان کے استدلالی مزاج کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مولانا نے بعد میں یہ سو روپے مولانا صمصام کی اہلیہ کو دیے، کیوں کہ یہ بات انھوں نے مجلس میں ہی کہہ دی تھی کہ یہ رقم انھیں نہیں دوں گا، اپنی بھابھی صاحبہ کو دوں گا۔

اس نوعیت کی بہت سی باتیں حضرت حافظ عبدالقادر روپڑی سنایا کرتے تھے، مگر افسوس آج نہ سنانے والے رہے، نہ وہ جن کی یہ باتیں تھیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کی حسنات قبول فرمائے اور انھیں جنت الفردوس عطا فرمائے۔ آمین۔

انیسواں باب

حکیم محمد عتیق الرحمٰن کا مکتوبِ گرامی

مولانا احمد الدین گکھڑوی سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لیے میں نے جن دوستوں سے ٹیلی فون پر رابطہ قائم کیا، ان میں جناب حکیم محمد عتیق الرحمٰن صاحب بھی شامل ہیں۔ انھوں نے اس سلسلے میں بہت تعاون کیا۔ وہ گوجراں والا بھی گئے اور مولانا محمد ابراہیم صاحب سے ملے جو برادری میں مولانا احمد الدین کے بھتیجے ہیں۔ ان سے جو معلومات حاصل ہوئیں، وہ حکیم صاحب نے مجھے بھجوادیں۔ اس پر میں ان کا بے حد شکر گزار ہوں۔ ذیل میں وہ خط ملاحظہ فرمایے جو حکیم صاحب نے مجھے لکھا۔ اس میں مولانا سے متعلق جو معلومات درج ہیں، اگرچہ ان میں سے بعض باتیں کتاب میں آگئی ہیں، لیکن اس خط کی صورت میں بھی قارئین کے علم میں آجائیں تو کیا مضائقہ ہے۔ یہ بڑی دلچسپ اور اہم باتیں ہیں جو مولانا احمد الدین سے متعلق تاریخ کا ضروری حصہ ہیں۔ خط کی اہمیت کے پیش نظر اسے کتاب کا ایک مستقل باب بنادیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمایے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرم ومحترم جناب بھٹی صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ رات کو ٹیلی فون پر آپ نے جو حکم دیا، اس کی تعمیل کے طور پر چند سطور لکھ رہا ہوں۔

مولانا احمد الدین گکھڑوی رحمۃ اللہ علیہ نظام آباد میں باغ والی مسجد اہل حدیث میں خطیب تھے۔ ہم لوگ الہٰ آباد میں مقیم ہیں۔ ان دونوں آبادیوں میں جی ٹی روڈ اور ریلوے

لائن حدِ فاصل ہے۔ اس وقت اللہ آباد میں اہل حدیث کی کوئی مسجد نہیں تھی۔ ہم لوگ نماز کے لیے نظام آباد میں، عام طور پر باغ والی مسجد ہی میں جاتے تھے۔ اب بحمد اللہ اللہ آباد میں اہل حدیث کی بارہ مسجدیں ہیں۔

سنا ہے کہ مولانا احمد الدین باغ والی مسجد اہل حدیث میں تقسیم ملک سے پہلے بھی خطیب رہے تھے۔ ہماری ہوش میں مولانا ممدوح کا یہ دوسرا دورِ خطابت تھا۔ مولانا گکھڑوی جمعۃ المبارک کی صبح کو اس ٹرین سے تشریف لایا کرتے تھے جو تقریباً آٹھ بجے گوجراں والا سے آتی تھی۔ وہ جمعہ پڑھاتے، رات یہیں قیام فرماتے، ہفتے کی صبح کو درسِ قرآن حکیم دیتے اور پھر آٹھ بجے کی ٹرین سے اپنے شہر گکھڑ چلے جاتے۔

مولانا مرحوم کا خطبۂ جمعہ اور درسِ قرآن حکیم ایسا مربوط اور مضبوط ہوتا کہ سننے والوں کے دلوں میں گھر کر جاتا۔

ان کا موضوع عام طور پر توحیدِ خالص ہوتا۔ وہ بدعی فرقوں کا پوسٹ مارٹم اس قدر مضبوط دلائل سے کرتے کہ کوئی تشنگی نہ رہتی۔ اگر شیعی مسلک کے بارے میں بات کرتے تو محسوس ہوتا کہ ان کا اصل موضوع یا ہدف تنقید یہی لوگ ہیں۔ اگر حجیتِ حدیث پر بات کرتے اور منکرینِ حدیث کے نقطۂ نظر کی تردید فرماتے تو یوں لگتا کہ ان کا موضوع دفاعِ حدیث اور ان لوگوں کا رد ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ عیسائیت، مرزائیت اور ہندو مذہب کے تو یوں سمجھیے کہ وہ حافظ تھے۔ بائیبل (عہد نامہ قدیم و جدید) اور مرزا غلام قادیانی کی تصانیف انھیں زبانی یاد تھیں۔ ان کی عبارتیں پڑھتے اور اسلام کی حقانیت اس طرح ثابت فرماتے کہ سننے والے ششدر رہ جاتے۔ ان میں یہ اعجاز دیکھا کہ جس موضوع پر تقریر فرماتے، اس کا حق ادا کر دیتے۔ خطبۂ جمعہ کے دوران جو بات سامعین کے ذہن میں آتی کہ اس کی وضاحت ہونی چاہیے، اس پر اس انداز سے گفتگو فرماتے کہ دلائل کے انبار لگا دیتے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ ایک سوال سطحِ ذہن پر ابھرا کہ

اس کا کیا جواب ہوسکتا ہے، مولانا نے اسی پر تقریر شروع کر دی اور اس سوال یا اعتراض کا اس طرح مدلل جواب دیا کہ معاملہ صاف ہو گیا۔ وہ جو کچھ فرماتے، قرآن و حدیث کی روشنی میں فرماتے اور پورے زور سے اپنی بات سامعین تک پہنچاتے۔

ایک مرتبہ ہفتے کی صبح کو وہ درسِ قرآن دے رہے تھے کہ بریلویت کے بارے میں کوئی مسئلہ زیر بحث آیا۔ لاؤڈ سپیکر پر یہ باتیں بریلوی مکتبِ فکر کے ایک شخص عزیز احمد نے بھی سنیں۔ درس ختم ہوا تو عزیز احمد مسجد میں آئے اور نہایت غصے کی حالت میں مولانا احمد الدین سے پنجابی میں مخاطب ہوئے کہ ''تم ہمیشہ ہمیں برا بھلا کہتے رہتے ہو، میں آج تمھارا علاج کروں گا۔'' ان کا خیال تھا کہ وہ وزیر آباد کے سب سے بڑے بریلوی عالم مولانا عبدالغفور ہزاروی کو لائیں گے جنھیں وہ قرآن و حدیث کے بہت بڑے عالم اور پیر طریقت کہا کرتے تھے۔ وہ مولانا احمد الدین سے گفتگو کریں گے اور ان کے مقابلے میں ان کی زبان بند ہو جائے گی۔ اب وہ مولانا عبدالغفور ہزاروی کو لانے کے لیے مسجد سے نکلنے لگے تو مولانا احمد الدین نے ان کو آواز دی۔ ''عزیز احمد! جاؤ۔ مولوی عبدالغفور سے کہو کہ احمد الدین نظام آباد کی باغ والی مسجد میں بیٹھا ہے، اگر وہ آ گیا تو میں لوہار کی اولاد نہیں۔'' (مولانا نے تو پنجابی کا ایک اور لفظ استعمال کیا تھا، لیکن میں نے اس کا ترجمہ ''اولاد'' کیا ہے۔)

انھوں نے کہا: مولوی عبدالغفور کیوں نہیں آئیں گے، میں ان پر بڑا مال خرچ کرتا ہوں۔

مولانا احمد الدین مرحوم نے عزیز احمد صاحب کو پھر آواز دی اور فرمایا کہ پہلے میں یہاں سے آٹھ بجے والی ٹرین سے گکھڑ جایا کرتا ہوں۔ آج گیارہ بجے والی ٹرین سے جاؤں گا۔ جاؤ مولوی عبدالغفور کو لاؤ۔

وہ صاحب غصے سے بھرے ہوئے تھے۔ دوڑتے ہوئے مسجد کے دروازے سے نکل رہے تھے کہ مولانا نے پھر آواز دی اور کہا: عزیز احمد! میرا نام سن کر مولوی عبدالغفور اگر

ریلوے کے سگنل تک بھی آ جائیں اور کوئی بات بھی نہ کریں تو بھی احمد الدین اپنی شکست مان لے گا۔ جاؤ انھیں لے کر آؤ۔

مسجد میں بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ اس واقعہ کا علم ہوا تو اور بھی کتنے ہی لوگ آ گئے۔ عزیز احمد نہایت غصے کی حالت میں مولانا عبدالغفور کے پاس گئے اور سارا قصہ ان سے بیان کیا اور کہا کہ آیئے مولوی احمد الدین سے بات کیجیے، لیکن مولانا عبدالغفور نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ انھوں نے بار بار کہا اور زور دے کر کہا کہ آج مولوی احمد الدین سے فیصلہ کن بات کر لینی چاہیے۔ لیکن مولانا عبدالغفور نہیں مانے اور کہا کہ میں اس کہاڑے (کلہاڑے) کے پاس ہرگز نہیں جاؤں گا۔

مولانا احمد الدین کو اللہ کے فضل سے اپنے علم اور سچائی پر پورا اعتماد تھا اور وہ ہر موضوع پر گفتگو کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ علم کے ساتھ ساتھ اللہ نے ان کو جرأت اور ہمت بھی عطا فرمائی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب انہی عزیز احمد مرحوم کے بھائی بشیر احمد اور ان کی اولاد پختہ فکر اہل حدیث ہیں اور ان کے بھتیجے سعید احمد اسی باغ والی مسجد اہل حدیث کی انجمن کے صدر ہیں اور جماعت اور مسلک کی خدمت کے لیے ہر وقت آمادہ و تیار رہتے ہیں۔

ایک اور واقعہ مولانا احمد الدین مرحوم نے سنایا جس کا مطلب یہ ہے کہ مناظرے میں مخالف فریق اپنے مدِ مقابل کی توجہ اصل موضوع سے ہٹا کر دوسری طرف مبذول کرانے کی کوشش کرتا ہے۔ مناظر کو چاہیے کہ اپنے موضوع میں رہے اور اس کی ان حرکات پر توجہ نہ دے۔ فرمایا کہ ایک دفعہ میرا مناظرہ بریلوی مکتب فکر کے عالم مولوی محمد عمر اچھروی کے ساتھ تھا۔ میرے معاون مولانا محمد اسماعیل سلفی مرحوم تھے۔

مناظرہ نبی صلی اللہ علیہ کے علم غیب پر تھا۔ مخالف فریق کسی اور بات کے دلائل دے رہا تھا اور میں کہہ رہا تھا کہ موضوع کے متعلق بات کی جائے۔ مولانا سلفی مرحوم مجھے چپکے سے کہنے لگے "احمد دین جو بات صحیح ہے اسے تو مانو"۔ میں نے کہا مولانا آپ چپ رہیں۔

جب اللہ تعالیٰ نے مناظرے میں ہمیں کامیابی دی تو بعد میں کھانے پر میں نے مولانا سلفی سے عرض کیا کہ اگر اس کی درست بات کو درست کہہ دیتے تو اسی وقت عوام کی طرف سے تالی بج جاتی کہ وہابی ہار گئے۔

مولانا احمد الدین مرحوم کی طبیعت نہایت سادہ تھی۔ ان کا لباس تھا کھدر کا کُرتا اور کھدر کا تہبند۔ پنڈلیاں نظر آتی تھیں۔ سر پر ہمیشہ کھدر کا صافہ (پرنا) باندھتے تھے۔ کسی قسم کا تکلف نہ تھا۔ اکثر اوقات انھیں اباجی مغفور (حکیم عبدالمجیدؒ) اپنے ساتھ گھر لے آتے یا کسی جلسے میں جانے کے لیے وہ خود ہمارے گھر تشریف لاتے تو اباجی مرحوم ان کے ساتھ جہاں وعظ کا پروگرام ہوتا چلے جاتے۔ مولانا کو کھانا دیا جاتا تو ظاہر ہے، مہمان کے لیے کچھ اہتمام تو کیا جاتا ہے۔ لیکن مولانا روٹی کے اوپر ہی گوشت کی ایک بوٹی رکھتے اور اسی کے ساتھ روٹی ختم کر دیتے۔ پھر فرماتے کہ ضرورت کے مطابق کھالیا ہے۔ کوئی اور چیز ان کے سامنے رکھی جاتی تو بڑی مشکل سے تھوڑی سی کھاتے۔

مولانا کی زندگی ہی میں اباجی مرحوم کی کوشش سے جامع مسجد اہل حدیث اللہ آباد بنی۔ ہر سال اہل حدیث کانفرنس کا انعقاد ہوتا، جس کا سارا پروگرام حضرت مولانا حافظ محمد شریف سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ ترتیب دیتے۔ نماز جمعہ سے رات گئے تک علماء کے خطابات ہوتے۔ ایسے ہی ایک پروگرام میں مولانا احمد الدین مرحوم کی تقریر تھی۔ دن کا وقت تھا۔ حاضری تو کافی تھی لیکن مولانا مرحوم کے خیال میں لوگ توجہ سے بات سن نہیں رہے تھے۔ انھوں نے فرمایا کہ لوگو میری بات توجہ سے سنو۔ جب میں نہیں ہوں گا تو آپ لوگ یاد کریں گے۔ غرض مولانا مرحوم سادگی، انکسار، خوش طبعی اور علم کی پختگی اور دلائل کی روانی، موضوع کے حق کی ادائیگی اور مسلک حقہ اہل حدیث کی تبلیغ میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ تکبر، انانیت، بڑاپن، علم کا ادعا اور اپنے آپ کو نمایاں کرنا جلسے میں یہ خواہش کہ ان کی شان کے برابر مقام ملے، دوسرے کی بات نہ سننا، باوجود بہت بڑے مناظر ہونے کے ایسی کوئی بات ان میں نہ تھی۔

دین کی تکمیل کے متعلق وہ ایک مثال دیا کرتے تھے کہ ایک گلاس میز پر رکھا جائے، اس میں کوئی مشروب ڈالا جائے، جس سے وہ بالکل بھر جائے، یہاں تک کہ اس میں اگر ایک قطرہ اور ڈالا جائے تو وہ قطرہ گلاس سے باہر نکل جائے گا یا ایک قطرہ اس سے نکالا جائے تو کم ہو جائے گا۔ فرمایا کرتے ''اکملت لکم دینکم'' کے یہی معنی ہیں۔ اسلام اتنا مکمل ہے کہ اس میں کمی بیشی کی کوئی گنجائش نہیں۔

چند سال پہلے ''الاعتصام'' میں کسی صاحب کا مولانا کے متعلق ایک مضمون چھپا تھا، جس میں صاحبِ مضمون نے مولانا سے نقل کیا تھا کہ وہ لوہے کا کام کرتے تھے۔ ایک دفعہ انھیں کسی انگریزی فرم نے توے بنانے کا آرڈر دیا۔ توے کافی تعداد میں بنانا تھے جو بنا دیے گئے۔ جب فرم کا افسر آیا اور اس نے توے سیمپل کے مطابق چیک کیے تو دو چار توے مقررہ سائز سے تھوڑے سے کم تھے۔ وہ توے اس نے نکال دیے۔ اس کی وجہ پوچھی تو بتایا کہ یہ اس سائز سے کم ہیں جو آپ کو دیا گیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ہم نے کہا ذرہ سی کمی سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اس انگریز نے کہا کہ دیئے گئے سائز سے کم ہو یا زیادہ اس سے فرق پڑتا ہے۔ انگریزی فرم کے کارندے تو مال لے کر چلے گئے۔ لیکن مولانا کہتے ہیں کہ میں سوچ میں پڑ گیا کہ وہابی بھی تو یہی کہتے ہیں کہ دین وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حکم کے مطابق ہو، نہ کم نہ زیادہ۔ بس یہ بات تھی کہ میں دین کا علم سیکھنے کے لیے کمر بستہ ہو گیا۔ اب میں دن کے بارہ بجے تک کام کرتا، اس کے بعد مولانا سلطان احمد صاحب نت کلاں والے کے ہاں چلا جاتا اور رات گئے تک پڑھتا رہتا۔

یاد رہے مولانا سلطان احمد صاحب استاد پنجاب حضرت حافظ عبدالمنان صاحب وزیر آبادی رحمۃ اللہ کے شاگرد تھے۔ حافظ صاحب مرحوم نے ان کو اپنی خودنوشت سوانح عمری دی تھی اور فرمایا تھا کہ اسے پنجابی نظم میں منتقل کریں۔ یہ خودنوشت سوانح پنجابی اشعار میں اب بھی موجود ہے اور آج تک حافظ صاحب کے متعلق جتنی بھی کتابیں لکھی گئی ہیں اسی سے ماخوذ ہیں۔

مولانا احمد الدین کی طبیعت میں یبوست نہ تھی بلکہ وہ خوش طبع تھے۔اسی باغ والی مسجد کے خادم حافظ نور حسین تھے جو نابینا تھے۔انھوں نے ان سے کہا کہ مولانا آپ کی دعوت ہے۔مولانا کہنے لگے حافظ دیکھو دعوت نوری ہونی چاہیے۔انھوں نے پوچھا: نوری سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: اس میں حلوا ہو، دیسی گھی ہو، بادام پستہ ہو، تب نوری ہوتی ہے۔

ایک کتاب ''تذکرہ مساجد اہل حدیث سیالکوٹ'' کے نام سے طبع ہوئی ہے۔اس میں ''جامع مسجد باغ ڈپٹی'' کے عنوان سے لکھا ہے کہ حضرت حافظ محمد شریفؒ صاحب نے دارالحدیث کے نام سے اس مسجد میں مدرسہ قائم کیا جس کے پہلے مدرس مولانا احمد الدین صاحب مرحوم تھے۔(1)

مولانا احمد الدین وزیر آباد کی مشہور مسجد جامع منانیہ کے بھی (جو محدث پنجاب حضرت حافظ عبدالمنانؒ کی مسجد ہے) کچھ عرصہ خطیب رہے ہیں۔

مولانا مرحوم نے تحریری کام بھی کیا ہے۔ان کی نظر چوں کہ بہت کمزور تھی، لوہے کا گرم کام کرنے کی وجہ سے نظر پر بڑا اثر پڑا تھا، اس لیے وہ آنکھوں کے بالکل قریب کر کے کتاب پڑھتے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ نے حافظہ بہت دیا تھا۔جو کتاب ایک دفعہ پڑھتے، دوسری دفعہ پڑھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔اس قدر کمزور نظر کے باوجود حضرت مولانا کو قرآن حکیم، حدیث شریف اور ان سے متعلقہ تمام کتب از بر تھیں۔اس کے علاوہ انھیں بائیبل (نیا عہد نامہ اور پرانا عہد نامہ) گرنتھ، وید اور ہندو مذہب کی بے شمار مذہبی باتیں زبانی یاد تھیں اور وہ ان کی کتابوں کے صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جاتے تھے۔

جو کتابیں انھوں نے تصنیف کی ہیں، وہ کسی سے لکھائی ہیں۔وہ بولتے جاتے تھے اور کوئی صاحب لکھتے جاتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاتھ کی کوئی تحریر نہیں ملتی۔چوں کہ وہ کامیاب مناظر تھے، اس لیے انھوں نے جو تصانیف مرتب کی ہیں ان کا انداز مناظرانہ ہے۔

---

(1) یہ کتاب حضرت مولانا محمد علی جانباز مرحوم کے صاحب زادۂ گرامی مولانا عبدالحنان ایم اے کی تصنیف ہے۔اپنے موضوع کی نہایت عمدہ کتاب ہے۔

جو کتابیں میرے پاس موجود تھیں اور اس وقت مل نہیں رہی ہیں، ان میں درج ذیل کتابیں مجھے یاد ہیں۔

1۔ قدامت اہل سنت والجماعت اہل حدیث: یہ کتاب پہلے سکول بک ڈپو گوجراں والا کی طرف سے چھپی۔ بعد میں ہم نے انجمن شبان اہل حدیث الہٰ آباد وزیر آباد کے زیر اہتمام چھپوائی۔

2۔ سیرت سید العالمین: یہ بھی سکول بک ڈپو گوجراں والا نے شائع کی۔

3۔ نجات الاسلام: یہ کتاب بھی سکول بک ڈپو کی طرف سے چھپی۔

4۔ وہ اپنے عہد کا نبی اور رسول: یہ بھی سکول بک ڈپو کے زیر اہتمام چھپی۔

اس کے علاوہ اور بھی چھوٹی چھوٹی کتابیں ہیں لیکن مجھے ان کے نام یاد نہیں۔ وہ کتابیں میرے پاس موجود تھیں لیکن اب مل نہیں رہی ہیں۔

محترم مولانا محمد ابراہیم صاحب (گوجراں والا) نے کچھ اور کتابوں کے نام لکھوائے ہیں، جو مل نہیں سکیں۔ وہ یہ ہیں۔

1۔ اسلام کی حقیقت: بقول مولانا محمد ابراہیم صاحب یہ 400 صفحات پر مشتمل کتاب تھی۔

2۔ اسلام اور عیسائیت کی حقیقت۔

3۔ قرآن اور عیسائیت کی وضاحت۔

4۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ مکرمہ کی زندگی اور اس کی واضح حقیقت۔(1)

مولانا احمد الدین مرحوم باوجود نظر کی کمزوری کے جب بھی دیکھو مطالعہ میں مشغول ہوتے یا پھر ذکر وافکار میں مگن۔ زیادہ گفتگو نہ کرتے، خاموشی کو پسند فرماتے۔ اکثر درود شریف، سورہ فاتحہ، سورہ اخلاص اور **لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ لہ الملک ولہ**

---

(1) غالباً یہ ان چاروں کتابوں کے مسودات ہوں گے، جو ضائع ہو گئے۔ مطبوعہ ہوتیں تو کسی نہ کسی سے ضرور مل جاتیں۔

الحمد یحیی ویمیت وھو علیٰ کل شیئ قدیر وردِزبان ہوتا۔

یہ چند باتیں تھیں جو مجھے یاد ہیں اور میں نے لکھ دی ہیں۔آپ انھیں خود ترتیب دے لیں۔اس درویش صفت عالم باعمل، متقی و پرہیزگار، اسلاف کی نشانی کے حالات تحریر کرنے پر ان شاء اللہ آپ بڑے اجروثواب کے مستحق ہوں گے۔یقیناً یہ ایک بڑا کام ہے۔اللہ تعالیٰ آپ کو اس کے بہت بہت اجر سے نوازے۔امین۔

نوٹ : مولانا محمد ابراہیم صاحب جو گوجراں والا میں اقامت گزیں ہیں، وہ اپنے آپ کو مولانا مرحوم کا بھتیجا بتاتے ہیں، یہ درحقیقت برادری میں ان کے بھتیجے ہیں۔ان کی باتوں کو ریکارڈ کر کے ان کی سی۔ڈی بنا کر ارسال کر رہا ہوں۔امید ہے کہ اس سے بھی آپ کو بہت کچھ ملے گا۔خصوصی اوقات میں اس عاجز کے لیے دعا کی درخواست ہے۔محترم ملک عبدالرشید عراقی صاحب فرماتے ہیں کہ چند ایک واقعات مجھے بھی مولانا سے متعلق یاد ہیں، جس کے لیے ان سے درخواست کی ہے کہ مجھے یا آپ کو براہ راست ارسال کر دیں۔(1)

خادم

حکیم محمد عتیق الرحمٰن

بیت العتیق، مین بازار، الہٰ آباد۔

وزیر آباد۔ضلع گوجراں والا۔

مورخہ 15-10-2010

☆☆☆

(1)۔ عراقی صاحب کی طرف سے مولانا گکھڑوی کے بارے میں وہ معلومات مجھے مل گئی ہیں، جن سے وہ آگاہ تھے۔ان معلومات کو کتاب کا بیسواں باب بنا دیا گیا ہے۔

بیسواں باب

مولانا گکھڑوی کے تین واقعات

ملک عبدالرشید عراقی متعدد کتابوں کے مصنف اور معروف مضمون نگار ہیں۔ جماعت اہلِ حدیث کے علاوہ دیگر فقہی مسالک کے رسائل و جرائد میں بھی ان کے رشحاتِ قلم کی اشاعت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ وہ ماشاءاللہ زودنویس اہل قلم ہیں اور مختلف عنوانات پر لکھتے ہیں، جس سے لوگ استفادہ کرتے ہیں۔ ان کا تعلق سوہدرہ کے مردم خیز قصبے سے ہے اور وہ وہاں کی ککے زئی برادری کے فرد ہیں۔ انھوں نے حکیم عتیق الرحمٰن صاحب کی وساطت سے مولانا احمد الدین گکھڑوی کے بارے میں مضمون ارسال فرمایا ہے جو تین واقعات پر مشتمل ہے اور یہ واقعات بڑے دلچسپ ہیں۔ اس کتاب میں ملک صاحب ممدوح کی اس تحریر کو ایک مستقل باب کے طور پر درج کیا جا رہا ہے۔ اس عنایت پر ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

1۔ قیامِ پاکستان سے قبل ہماری ککے زئی برادری کے ایک آدمی مرزا غلام احمد قادیانی کے پیرو ہو گئے۔ مولانا عبدالمجید سوہدروی کو خبر ہوئی تو انھوں نے مولانا احمد الدین گکھڑوی کو بلایا۔ مولانا احمد الدین مرحوم نے ہماری مسجد ککے زیاں میں تین گھنٹے تقریر کی، جس میں انھوں نے قادیانی فرقے کے عقائد اور مرزائے قادیان کے افکار و نظریات تفصیل سے بیان کیے۔ چنانچہ قادیانی ہونے والا شخص تائب ہو گیا اور اس کے بعد اس شخص نے بغیر استاد کے قرآن مجید حفظ کیا۔

2۔ مولانا عبدالمجید سوہدروی اور مولانا احمد الدین کے مابین لطائف وظرائف کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ مولانا عبدالمجید ''مسلمان'' کے نام سے اخبار نکالا کرتے تھے۔ ایک دفعہ

سوہدرہ میں دوران تقریر مولانا احمد الدین نے فرمایا کہ منڈی وار برٹن میں جلسہ تھا، میں نے جلسے کے منتظمین سے کہا کہ میری دوسری تقریر ہونی چاہیے، اس لیے کہ مجھے ایک نجی کام کے سلسلے میں لاہور جانا ہے۔ منتظمین نے اس سے اتفاق کیا۔ چنانچہ پہلی تقریر مولانا نور حسین گھر جاکھی نے کی۔ جب ان کی تقریر ختم ہوئی تو مولانا عبدالمجید سوہدروی تقریر کرنے لیے مائیک پر آگئے اور میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ مولانا سوہدروی کی تقریر کے بعد مجھے تقریر کے لیے بلایا گیا تو میں نے خطبہ مسنونہ کے بعد حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا:

''دوسری تقریر میں نے کرنی تھی، لیکن میری جگہ سوہدرے کا مسلمان مائیک پر آگیا اور میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ مولانا احمد الدین کے ان الفاظ پر حاضرین بہت محظوظ ہوئے۔''

ایک دفعہ مولانا احمد الدین سوہدرہ تشریف لائے۔

3۔ دورانِ تقریر مولانا مرحوم نے کہا کہ میرا ایک شاگرد جس کا تعلق آزاد کشمیر کے ایک گاؤں سے تھا، مجھے تقریر کے لیے اپنے گاؤں لے گیا۔ گرمیوں کا موسم تھا اور ہم مغرب کے قریب گاؤں پہنچے۔ مغرب کی اذان ہو چکی تھی۔ گاؤں کے باہر ایک مسجد تھی۔ ہم دونوں نماز مغرب کے لیے مسجد میں چلے گے۔ ہمارے وضو کرتے کرتے ایک رکعت نکل گئی۔ دوسری رکعت میں میں نے بلند آواز سے آمین کہی۔ جب جماعت ہو گئی تو ایک آدمی نے مجھے کہا:

آپ کی نماز نہیں ہوئی۔

میں نے کہا: کیسے نماز نہیں ہوئی؟

اس نے جواب دیا: آپ نے امام صاحب کی مخالفت کی ہے۔

میں نے کہا: میں نے تو کوئی مخالفت نہیں کی۔

اس نے جواب دیا: آپ نے رفع الیدین کی ہے اور آمین بلند آواز سے کہی ہے جب کہ امام صاحب نے نہ رفع الیدین کی ہے اور نہ بلند آواز سے آمین کہی ہے، اس لیے آپ کی نماز نہیں ہوئی۔

میں تھوڑی دیر خاموش رہا۔ اس کے بعد میں نے اس شخص سے مخاطب ہو کر کہا: آپ تمام لوگوں کی جنھوں نے مغرب کی نماز ادا کی ہے، کسی کی بھی نماز نہیں ہوئی۔

وہ شخص کہنے لگا: کیسے ہماری نماز نہیں ہوئی؟

میں نے کہا: آپ کے امام صاحب نے اونچی آواز میں سورہ فاتحہ پڑھی ہے اور آپ سب نے سورۃ فاتحہ نہیں پڑھی تو آپ نے بھی امام صاحب کی مخالفت کی ہے، اس لیے آپ تمام لوگوں کی نماز نہیں ہوئی۔

اس پر اس شخص نے اور دوسرے دو تین آدمیوں نے اپنے امام صاحب سے کہا کہ مولوی صاحب اس کا جواب دیں۔ آپ تو کہا کرتے ہیں کہ جو شخص امام کی مخالفت کرے، اس کی نماز نہیں ہوتی۔ ہم تو نماز میں سورۃ فاتحہ نہیں پڑھتے، آپ پڑھتے ہیں۔

امام صاحب اس کا کوئی جواب نہ دے سکے۔ اس کے بعد میں نے سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بارے میں انھیں احادیث سنائیں تو وہ اس کے قائل ہو گئے کہ نماز سری ہو یا جہری، اس میں سورۂ فاتحہ پڑھنی چاہیے۔

اس قسم کے اور بھی بہت سے واقعات ہوں گے جو ہمارے علم میں نہیں آئے۔ ان واقعات سے پتا چلتا ہے کہ وہ ہر وقت، ہر موقعے پر اور ہر مقام میں کلمۂ حق کے لیے تیار رہتے تھے۔ جہاں کسی کے قدم صحیح راہ سے ڈگمگاتے ہوئے دیکھتے، اسے ٹوکتے اور صحیح راہ پر گامزن ہونے کی تلقین فرماتے۔ اس قسم کے حق گو اور صاف کلام لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔



اکیسواں باب

مولانا احمد الدین کے متعلق مولانا محمد ابراہیم کی معلومات

مولانا احمد الدین گکھڑوی کے بارے میں مولانا محمد ابراہیم صاحب سے مندرجہ ذیل معلومات گوجراں والا جا کر حکیم محمد عتیق الرحمٰن صاحب نے حاصل کیں۔ انھوں نے معلومات کی سی۔ڈی بنا کر مجھے بھجوائی۔ جامعہ سلفیہ فیصل آباد کے مدرس مولانا حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی نے یہ سی۔ڈی کاغذ پر منتقل کی۔ اس پر میں مولانا محمد ابراہیم، حکیم عتیق الرحمٰن اور حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی کا شکر گزار ہوں۔

حکیم عتیق الرحمٰن: السلام علیکم

مولانا محمد ابراہیم: وعلیکم السلام

حکیم صاحب: حضرت! آپ کا تعارف اور مقامِ سکونت؟

محمد ابراہیم: محمد ابراہیم بن غلام رسول۔ مقام سکونت گوجراں والا

حکیم صاحب: مولانا احمد الدین گکھڑوی سے آپ کا کیا تعلق ہے؟ ان سے آپ کی کوئی رشتے داری ہے؟

محمد ابراہیم: مولانا احمد الدین سے ہماری رشتے داری یہ ہے کہ ان کی سگی بھتیجی کی شادی میرے تایا کے بیٹے سے ہوئی۔

حکیم صاحب: مولانا احمد الدین گکھڑوی کے حالات میں جناب محمد اسحاق بھٹی صاحب ایک کتاب لکھ رہے ہیں۔ انھوں نے کہا ہے کہ ان کے متعلق آپ جو بھی تھوڑی بہت معلومات رکھتے ہیں، ان سے مطلع کیجیے۔ وہ معلومات آپ کے حوالے سے کتاب میں درج کی جائیں گی۔

مولانا محمد ابراہیم: مولانا احمد الدین گکھڑوی بہت بڑے عالم دین اور مناظر تھے۔ وہ سکھوں کی مذہبی کتاب گرنتھ صاحب، ہندوؤں کے وید اور یہودیوں کی تورات اور عیسائیوں کی کتاب انجیل کے متعلق بھی بہت کچھ جانتے تھے۔ بلکہ ان کے صفحات کے صفحات انھیں زبانی یاد تھے۔ میرے پاس ان کے بارے میں جو بھی معلومات ہیں، وہ آپ کو بتا دیتا ہوں اور ان کے مناظروں کی جس تفصیل کا مجھے علم ہے، وہ آپ کے سامنے رکھ دیتا ہوں۔

1۔   ڈچکوٹ کا مناظرہ:

ان کے ایک مناظرے کا تعلق سمندری (ضلع فیصل آباد) سے ہے۔ وہاں ایک عیسائی پادری ایک مرتبہ آزادیٔ وطن سے پہلے برطانیہ سے آیا تھا۔ اس نے تحصیل سمندری کے ایک مقام پر تقریر کرتے ہوئے مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ اپنے مذہب اور اپنے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں کوئی حقیقت واضح کرو۔ اس موضوع پر اس نے مسلمانوں کو مناظرے کی دعوت دی۔ وہاں بریلوی حضرات کی اکثریت تھی۔ وہ مولانا سردار احمد صاحب کی خدمت میں لائل پور (موجودہ فیصل آباد) گئے۔ مولانا سردار احمد نے کہا کہ میں نے عیسائیوں سے کبھی مناظرہ نہیں کیا۔ ایک اہل حدیث عالم جن کا نام مولانا احمد الدین ہے، گکھڑ رہتے ہیں۔ انھیں عیسائیوں کے متعلق بہت معلومات حاصل ہیں۔ وہ اس پادری کے ساتھ مناظرہ کر سکتے ہیں۔ مولانا احمد الدین کا پتا کیا گیا تو وہ اس وقت اپنے مسکن گکھڑ میں نہیں تھے، امرتسر گئے تھے۔ انھیں امرتسر پیغام پہنچا تو فوراً سمندری پہنچے، لیکن مناظرہ سمندری میں نہیں ہوا، ڈچکوٹ میں ہوا۔ موضوعِ مناظرہ تین باتیں تھیں۔

☆ اول: پادری نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی لیکن آپ کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف وحی نہیں بھیجی۔

مولانا احمد الدین نے کہا کہ ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا مرتبہ بہت اونچا ہے،

اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی بھی بھیجی ہے اور انھیں تمام انبیا علیہم السلام کے سردار بھی قرار دیا ہے۔ خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ ''یأتی من بعدی اسمہ احمد'' کہ میرے بعد ایک نبی آئے گا جس کا نام احمد ہوگا (صلی اللہ علیہ وسلم) جو بھی اس کی پیروی کرے گا، وہ عیسائیوں میں سے ہو یا مسلمانوں میں سے، وہ کامیاب ہوگا۔ اللہ کے نزدیک مومن وہی ہے جو اس نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا تابع فرمان ہے۔

اس موضوع پر گفتگو آگے بڑھی تو مولانا احمد الدین نے کہا کہ آپ کی کتاب انجیل میں لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ میں اس نبی کی شان کو نہیں پہنچ سکتا۔ اس نبی کا مرتبہ مجھ سے بہت بڑا ہے اور وہ اونچی شان والا نبی ہے (صلی اللہ علیہ وسلم)۔

☆ دوم: دوسری بات اس پادری نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کے بارے میں کی جو انھوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے کیا تھا۔ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا اس وقت بہت کم عمر تھیں۔ اس کا جواب مولانا احمد الدین نے جس انداز میں دیا، اس جواب پر پادری صاحب کی ذہنی کیفیت بالکل بدل گئی۔ انھوں نے کہا کہ اپنے مذہب کی مجبوری کی بنا پر میں مانوں یا نہ مانوں لیکن مولانا احمد الدین کے اس جواب پر مَیں کوئی اعتراض نہیں کرسکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس معاملے میں مولانا احمد الدین سچے ہیں اور میں جھوٹا ہوں۔ انھوں نے مجمعِ عام میں تحریری طور پر بھی اس مسئلے میں اپنی شکست کا اعتراف کیا۔ (1)

☆ سوم: تیسرا مسئلہ یہ تھا کہ آپ کہتے ہیں اسلام میں ایک عورت کی گواہی قبول نہیں، ایک مرد کے مقابلے دو عورتیں گواہ ہونی چاہئیں۔

مولانا نے اس کا یہ جواب دیا کہ یہ بات مَیں نے یا کسی اور مذہبی عالم نے نہیں کہی بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ دو عورتوں کی گواہی اس لیے ہے کہ ایک اگر بھول جائے تو دوسری اسے یاد کرادے۔

مولانا نے یہ مسئلہ اس انداز میں بیان فرمایا کہ پادری کو مولانا کے موقف کی صداقت کو تسلیم کرنا پڑا۔

مناظرۂ ڈچکوٹ کے ان تینوں مسئلوں میں مولانا احمد الدین گکھڑوی کے مقابلے میں پادری کو ہزیمت ہوئی اور مولانا محمد ابراہیم کے بقول انھوں نے یہ لکھا کہ مولانا کا موقف مبنی بر صحت ہے اور میں غلطی پر ہوں۔ میں مولانا کے زور بیان اور دلائل کا مقابلہ نہیں کر سکا۔

2۔ مناظرہ ڈھرکی (سندھ):

موضع ڈھرکی (صوبہ سندھ) میں مولانا احمد الدین کا ایک یہودی سے مناظرہ ہوا۔ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کیں۔ مولانا احمد الدین نے بہت اچھے انداز میں جواب دیے، یہودی نے تسلیم کیا کہ دلائل کے سلسلے میں معلوم ہوتا ہے کہ میں کمزور ہوں اور مولانا احمد الدین کامیاب ہیں۔

(1)۔ اس کا تذکرہ مناسب الفاظ میں اس کتاب کے نویں باب میں ہو چکا ہے، جس کا عنوان ہے "عیسائی پادریوں سے مناظرے اور مباحثے"۔ یہاں اس کا دوبارہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

اس کے بعد یہودی نے کہا کہ سلیمان (علیہ السلام) نبی نہیں تھے اور نہ داؤد (علیہ السلام) کے بیٹے تھے۔ مولانا نے کہا کہ آپ کی تورات میں لکھا ہے کہ داؤد بڑی شان والے نبی ہیں اور ان کے بیٹے سلیمان ہیں۔ یہ بھی بہت بڑے نبی ہیں، اور بہت سمجھ دار ہیں اور دونوں باپ بیٹا نبی ہونے کے ساتھ بادشاہ بھی ہیں، اور انھوں نے بہت اچھے طریقے سے دنیا میں زندگی گزاری ہے۔ وہ اللہ کے سچے نبی تھے، ان کی صداقت میں کوئی شک نہیں۔ تورات میں یہ باتیں واضح الفاظ میں لکھی ہیں۔ پھر یہودی نے مولانا احمد الدین سے کہا: میں آپ کی دلیل تسلیم کرتا ہوں۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ آپ کے پاس دلائل ہیں اور میرے پاس اس بارے میں دلائل نہیں ہیں۔ میں لکھ کر دیتا ہوں کہ میں شکست کھا چکا ہوں اور آپ کامیاب رہے ہیں۔

3۔ سانگلہ ہل میں مناظرہ

ایک مناظرہ سانگلہ ہل میں بریلوی حضرات کے مشہور عالم مولانا عنایت اللہ صاحب سے ہوا۔ موضوع تھا، ''نور من نور اللہ''۔ مولانا عنایت اللہ صاحب نے کہا کہ قرآن میں آتا ہے ''نور من نور اللہ''۔ (یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے نور میں سے نور ہیں) مولانا احمد الدین صاحب نے حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا آپ سب لوگ سن رہے ہیں، مسلمان ہونے کے ناتے سے آپ حق کا ساتھ دیں، باطل کا ساتھ نہ دیں۔ مولانا عنایت اللہ نے کہا ہے کہ قرآن میں ''نور من نور اللہ'' موجود ہے، حالاں کہ پورے قرآن میں یہ الفاظ موجود نہیں ہیں۔ البتہ ''نور علیٰ نور'' کے الفاظ سورۂ نور (پارہ 18) میں موجود ہیں۔ (یعنی روشنی پر روشنی)۔ ''نور من نور اللہ'' کہیں نہیں ہے۔ یہ شرک ہے۔

اس کے بعد مولوی عنایت اللہ صاحب نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غیب جانتے تھے۔ مولانا احمد الدین نے کہا کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غیب جانتے تھے تو وہ ستر (70) صحابہ جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بئر معونہ میں بھیجے تھے، کیا وہ جان بوجھ کر بھیجے تھے تاکہ ہلاک ہو جائیں۔ (نعوذ باللہ)

اس پر مولانا عنایت اللہ نے کہا، اس سلسلے میں میری تھوڑی سی غلطی ہے تاہم میں حق پر ہوں۔

پھر اس تھانیدار نے جو انتظام کے لیے آیا تھا کہا کہ باقی باتیں تھانے میں ہوں گی۔ اب مولانا احمد الدین اور مولانا عنایت اللہ صاحب تھانے پہنچ گئے۔ تھانے میں جب دوبارہ مناظرہ شروع ہوا تو مولوی عنایت اللہ صاحب نے کہا کہ میں ''نور من نور اللہ'' کے الفاظ قرآن سے دکھاتا ہوں۔ وہ قرآن میں غور سے دیکھتے رہے۔ دو گھنٹے تلاش کرنے کے بعد بھی وہ قرآن سے ''نور من نور اللہ'' کے الفاظ نہ دکھا سکے۔ تھانے دار نے مولوی عنایت اللہ صاحب سے کہا کہ مولانا آپ جھوٹے ہیں۔ یہ لکھ کر دیں کہ یہ الفاظ قرآن میں نہیں ہیں

اور میں غلطی پر ہوں، لیکن مولوی عنایت اللہ نے لکھ کر تو نہ دیا، البتہ یہ تسلیم کیا کہ میں شکست کھا چکا ہوں۔ لکھ کر دوں گا تو میرا مذہب جھوٹا ثابت ہوتا ہے جب کہ میرا مذہب صداقت پر مبنی ہے۔

مولوی عنایت اللہ نے کہا اصل بات یہ ہے کہ ''نورعلیٰ نور'' جو قرآن میں موجود ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارا پیغمبر نور پر نور ہے۔ مولانا احمد الدین صاحب نے کہا پہلے نور من نور اللہ کا مطلب واضح کریں، پھر دوسری بات کریں۔ نورعلیٰ نور کے معنی روشنی پر روشنی کے ہیں، لیکن نور من نور اللہ کا مطلب رب کے نور میں سے نور ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتا ہے ''لم یلد ولم یولد'' (یعنی نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ اس کو کسی نے جنا)، پھر مولوی عنایت اللہ نے کہا کہ میں اس معاملے میں بھی شکست تسلیم کرتا ہوں کیوں کہ میرے دلائل کمزور ہیں اور مولوی احمد الدین کے دلائل قوی ہیں مگر میں یہ بات لکھوں گا نہیں۔

4۔ سنجورو ضلع سانگھڑ (سندھ):

ایک مناظرہ سنجورو ضلع سانگھڑ (سندھ) میں مرزائیوں اور مسلمانوں کے درمیان ہوا۔ یہ مناظرہ تین دن جاری رہا، علمائے کرام آتے رہے اور مرزائیوں کا جواب دیتے رہے۔ پھر آخر میں چوتھے دن مولانا احمد الدین صاحب کو بلایا گیا۔ مولانا صاحب نے فرمایا کہ مناظرے کے اصول واضح کیے جائیں، پھر اصول کے مطابق دس دس منٹ کی ٹرم رکھی گئی۔ دونوں فریقوں کو دس منٹ کے اندر اپنا موقف واضح کرنا ہوگا۔ جب ایک فریق اپنا موقف بیان کر رہا ہو تو دوسرے فریق کو درمیان میں بولنے کی اجازت نہیں۔ وہ اپنی باری کا انتظار کرے۔

جب مناظرہ شروع ہوا تو مرزائی مناظر نے کہا کہ ہم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خاتم النبین مانتے ہیں لیکن جو ہمارا نبی ہے، وہ خادم نبی ہے۔ ہم اسے کامل نبی نہیں سمجھتے۔ مولانا احمد الدین صاحب نے کہا جو خادم نبی ہے، اس کی حیثیت بھی نبی کی سی ہے، اس لیے

خادمیت کے لفظ قرآن وحدیث سے دکھلائیں۔اب مرزائی مناظر کافی دیر قرآن وحدیث سے خادمیت کا لفظ ڈھونڈتا رہا، لیکن اسے یہ لفظ نہیں ملے۔ پھر مرزائی نے اپنے مناظر اور کتابوں کو لے کر چلے گئے۔

5۔ سنجورو میں ایک اور مناظرہ

اس کے بعد پھر ایک اور مناظرہ سنجورو ہی میں مرزائیوں کے ساتھ ہوا۔ اس میں قادیانی مناظر نے چیلنج کیا اور مولانا احمد الدین صاحب نے اس کا چیلنج قبول کیا۔ مرزائی مناظر نے مولانا سے کہا کہ آپ نے خاتم النبیین کے لفظ سے یہ ثابت کرنا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور میں نے یہ ثابت کرنا ہے کہ خاتم النبیین کے بعد ایک اور نبی آئے گا اور میں اس کے دلائل دوں گا۔ مناظرہ ہوا لیکن مرزائی مناظر اپنی کسی ٹرم میں اپنے کسی دعوے کو ثابت نہیں کر سکا اور قرآن وحدیث سے کوئی دلیل نہیں دے سکا کہ مرزا غلام احمد قادیانی یا کوئی اور شخص نبی ہوگا۔

مولانا احمد الدین صاحب نے کہا کہ میں اپنے اس دعوے کے ثبوت میں دلائل دے چکا ہوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی یا کوئی غلام اور خادم نبی نہیں آئے گا۔ ہاں جو بھی آئے گا وہ کذاب ہوگا، دجال ہوگا۔ کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میرے بعد جھوٹے نبی پیدا ہوں گے، لہٰذا مرزا قادیانی جھوٹا نبی ہوا۔

اس مناظرے میں مرزائیوں کو شکست ہوئی۔

6۔ نارووال میں مناظرہ

مولانا احمد الدین کا ایک مناظرہ نارووال (ضلع سیالکوٹ) میں ایک مرزائی کے ساتھ ہوا۔ مرزائی نے مولانا احمد الدین صاحب سے کہا کہ آپ نے یہ ثابت کرنا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ آئیں گے۔ مولانا احمد الدین صاحب نے کہا کہ میرے پاس دلائل موجود ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ آئیں گے اور دجال کو قتل کریں گے۔ حدیث میں

آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں آئیں گے، ملک شام کے شہر دمشق کی جامع مسجد میں دو فرشتوں کے سہارے سے اتریں گے۔ پھر وہ امام مہدی کے پیچھے نماز پڑھیں گے۔ امام مہدی ان کا اصل نام نہیں، لقب ہے۔ واضح دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں آئیں گے اور ضرور آئیں گے۔ یہ جو آپ کہتے ہیں کہ مسیح موعود مرزا غلام احمد قادیانی ہے، یہ حدیث کی کسی کتاب سے ثابت نہیں ہوتا، بلکہ مرزا تو جھوٹ بولتا ہے۔ کبھی کہتا ہے کہ مَیں ہی مریم ہوں، مَیں ہی خدا ہوں، مَیں ہی عیسیٰ ہوں اور مَیں نے ہی عیسیٰ کی طرف وحی کی ہے۔ کبھی نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اور کبھی خدا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، اس کا دماغ خراب ہے۔ جب کہ نبی کا دماغ خراب نہیں ہوتا۔ نبی جو بات کہتا ہے قوم کی بھلائی کے لیے کہتا ہے، دانائی کی بات کہتا ہے۔ نبی کبھی جھوٹ نہیں بولتا، نبی اپنے پاس سے کوئی بات نہیں کہتا۔ نبی کسی سلسلے میں نہ کوئی زیادتی کرتا ہے اور نہ کمی کرتا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی ہیں اور سچے نبی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ جن کا یہ دعویٰ ہے کہ غلام احمد مسیح موعود ہے، وہ جھوٹے ہیں، البتہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آنا ہے، وہی مسیح موعود ہیں، مرزا غلام احمد مسیح موعود نہیں ہے۔ اس کا نام غلام احمد ہے اور عیسیٰ علیہ السلام نے یہ کہیں نہیں کہا کہ میں غلام احمد ہوں۔ مرزا کذاب ہے کیوں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ''لا نبی بعدی'' میں خاتم النبیین ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، البتہ جھوٹے دجال پیدا ہوں گے، اور مرزا غلام احمد ان ہی میں سے ہے۔

اس مناظرے میں بھی مرزائیوں کو شکست ہوئی۔

7۔ ایک اور مناظرہ

اس کے بعد مرزائیوں کے ساتھ ایک مناظرہ تین دن ہوتا رہا۔ وہ کسی بھی بات پر متفق نہیں ہوتے تھے۔ مرزائی مناظر نے مولانا احمد الدین صاحب سے مناظرہ نہیں کیا تھا۔

جب مولانا احمد الدین سے مناظرے کا فیصلہ ہوا تو تین گھنٹوں تک بحث ومباحثہ چلتا رہا۔ مرزائی مناظر نے کہا کہ یہ وہابی کتے ہیں، اس طرح اس نے مسلمانوں کو لڑانے کی کوشش کی۔ مولانا احمد الدین صاحب نے یہ الفاظ سن کر بڑے تحمل سے جواب دیا کہ ہم بے ایمان مرزائیوں کے مقابلے میں شیعہ، سنی، دیوبندی، بریلوی، اہل حدیث سب اکھٹے ہیں۔ اس لیے اس نے وہابیوں کو نہیں تمام مسلمانوں کو کتے کہا ہے۔ ہم محمدی باغ کے پہرے دار ہیں، ہم مرزا سور کو ہرگز اس میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ یہ سن کر مرزائی مناظرہ چھوڑ کر بھاگ گئے اور شام کے وقت یہ نعرہ گونج رہا تھا کہ مولانا احمد الدین زندہ آباد اور مرزائی مذہب مردہ آباد۔

8۔ ڈچکوٹ کا ایک اور مناظرہ

ایک اور مناظرہ ڈچکوٹ کے علاقے میں مولانا احمد الدین صاحب نے کیا۔ وہ اس طرح کہ ایک پادری نے جو لندن سے آیا تھا، کہا کہ کوئی مسلمان میرے مقابلے میں آ کر مجھ سے بات کرے۔ میں مریم صدیقہ، عیسیٰ اور اللہ کے بارے میں جو غلط فہمیاں ہیں، وہ بہ دلائل دور کروں گا۔ اس نے اور بھی بہت سی باتیں کیں، تو بریلوی حضرات نے اپنے عالم مولوی سردار احمد سے اس پادری کے ساتھ مناظرے کے لیے کہا، لیکن مولانا سردار احمد نے مناظرہ نہیں کیا۔ البتہ مولانا احمد الدین نے مناظرہ کیا۔ اس پادری نے کہا کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں۔ مولانا احمد الدین صاحب نے انجیل کے مسلسل چھبیس صفحات پڑھے اور کہا کہ عیسائیو! یہ تمھاری کتاب ہے۔ ہم بھی یہ مانتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا کے سچے نبی ہیں۔ میں نے انجیل کے چھبیس صفحات پڑھے ہیں، ان میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں واضح طور سے کہا گیا ہے کہ ”قال انی عبداللہ“ (لوگو! میں اللہ کا بندہ ہوں۔) ان چھبیس صفحات میں کہیں بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق یہ نہیں کہا گیا کہ میں اللہ کا بیٹا ہوں۔ ان پادری صاحب سے جو یہاں موجود ہیں، میری گزارش ہے کہ یہ جو میں نے

چھبیس صفحات پڑھے ہیں، ان میں سے ثابت کریں کہ کہیں یہ کہا گیا ہو کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے تھے۔ پادری صاحب دیر تک انجیل میں یہ الفاظ تلاش کرتے رہے، لیکن نا کام رہے۔ یہاں یہ یاد رہے کہ پادری صاحب نے اپنے موقف کی تائید میں انہی صفحات کے حوالے دیے تھے اور ان میں ان کے حوالے کی کوئی بات بھی نہ تھی۔ مولانا نے فرمایا کہ عیسائیوں کے پاس اللہ کی طرف سے نازل شدہ انجیل نہیں ہے۔ یہ چار انجیلیں انھوں نے خود بنائی ہیں۔ لوقا کی انجیل، یوحنا کی انجیل، متی کی انجیل اور مرقس کی انجیل وغیرہ۔ انھوں نے کہا ایک انجیل سے چار انجیلیں بنا ڈالیں۔ ایک عام آدمی کس طرح ثابت کرے گا کہ ان میں سے کون سی سچی ہے اور کون سی جھوٹی۔ پھر مولانا احمد الدین صاحب نے دلائل دیتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ ان چاروں انجیلوں میں سے یوحنا کی انجیل قدرے سچی ہے۔ باقی انجیلوں میں شام اور عراق میں بیٹھ کر کمی بیشی کی گئی ہے اور برطانیہ میں اپنے پاس سے لکھ لکھا کر انجیل میں اضافہ کیا گیا ہے، اور اس میں لکھا ہے کہ عیسیٰ خدا کا بیٹا ہے، مریم صدیقہ خدا کی بیوی ہے۔ یہ سب جھوٹ ہے۔

مولانا نے پادری صاحب سے کہا: آپ برطانیہ سے سفر کر کے میرے ساتھ مناظرہ کرنے آئے ہیں۔ آپ یہ ثابت کریں کہ جو میں نے چھبیس صفحات انجیل سے پڑھے ہیں، کیا ان میں کہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا گیا ہے؟ یا انھوں نے خود فرمایا ہے کہ میں اللہ کا بیٹا ہوں؟ یہ آپ کو ثابت کرنا پڑے گا ورنہ لکھ کر دینا ہوگا کہ میں (پادری) جھوٹا ہوں اور میرے سب ساتھی جھوٹے ہیں۔ اس لیے کہ آپ کے پاس کوئی صحیح دلیل نہیں ہے۔ جب تک آپ اپنے حق میں دلیل نہیں دیں گے، احمد الدین مناظرہ جاری رکھے گا اور میدان سے آپ کو جانے نہیں دے گا، یا پھر آپ لکھ کر دیں کہ ہم نے انجیل میں اضافہ کیا ہے اور اپنا مذہب خود بنایا ہے۔ لہٰذا ہم جھوٹے مذہب سے عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا اور مریم صدیقہ کو خدا کی بیوی کہہ رہے ہیں۔ یہ سب باتیں انجیل میں نہیں ہیں، اور یہ کہ آپ لکھ

کردیں کہ مسلمان اپنے مذہب میں سچے ہیں۔ یہ لکھ کردیں گے تو مناظرہ ختم ہوگا۔

بہرحال پادری صاحب کوئی ایک بھی دلیل اپنے دعوے کے ثبوت میں نہ پیش کر سکے اور یہ ثابت نہ کر سکے کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں اور مریم صدیقہ اللہ کی بیوی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تقریباً 13 گاؤں کے افراد نے اسلام قبول کرلیا اور 13 پادریوں میں سے 9 پادری اسلام قبول کر کے اہل حدیث ہو گئے، جن میں سے ایک پادری عراق میں زندہ ہے۔ اس کا نام سعید ہے۔



بائیسواں باب

مولانا احمدالدین گکھڑوی کے چند واقعات

(مولانا محمد رفیق سلفی کی زبانی)

مولانا محمد رفیق سلفی کا تعارف جامعہ سلفیہ کے استاذ حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی ان الفاظ میں کراتے ہیں۔

مولانا محمد رفیق سلفی 1936ء میں موضع شہورہ تحصیل اجنالہ ضلع امرتسر میں پیدا ہوئے۔قیام پاکستان کے وقت عمر 10 سال تھی اور چوتھی جماعت کے طالب علم تھے۔تقسیمِ ملک کے بعد پاکستان آکر رام گڑھ (موجودہ مجاہد آباد) لاہور میں رہائش پذیر ہوئے۔ قریب کی آبادی مغل پورہ میں حافظ محمد یوسف گکھڑوی مرحوم کی کوشش سے جامع مسجد توحید گنج اہل حدیث بنائی گئی۔اس وقت اس مسجد میں قاری محمد ابراہیم امام و مدرس تھےاور حافظ محمد اسماعیل ذبیح مرحوم خطیب......! مولانا محمد رفیق سلفی صاحب نے ان سے ابتدائی دینی تعلیم حاصل کی۔

1948ء میں لاہور سے موضع راہوالی نزد گوجراں والا میں منتقل ہوگئے۔

ابتدا میں راہوالی سے گکھڑ حافظ محمد یوسف صاحب سے پڑھنے کے لیے جاتے رہے۔ بعدازاں گوجراں والا میں شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی رحمۃ اللہ علیہ سے تعلیم حاصل کی اور مولانا محمد خالد گرجاکھی مرحوم سے صحیح بخاری کا درس لیا۔

راہوالی میں مسجد اہل حدیث کے لیے جی ٹی روڈ سے مغربی جانب دس مرلے جگہ خریدی اور 1963ء میں مسجد تعمیر کی۔

مولانا محمد رفیق سلفی کامیاب خطیب ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ راہوالی میں جمعے کا سب سے بڑا اجتماع انہی کی مسجد میں ہوتا ہے۔ بہترین مناظر بھی ہیں اور بیسیوں کامیاب مناظرے دیوبندیوں، بریلویوں، شیعوں، عیسائیوں اور مرزائیوں سے کیے۔ خصوصاً عیسائیت اور مرزائیت کے متعلق ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔

مولانا محمد رفیق سلفی کی تبلیغی جدوجہد کا حلقہ پورے پنجاب میں پھیلا ہوا ہے۔ خصوصاً ضلع گوجراں والا کا کوئی گاؤں اور شہر ایسا نہیں جہاں وہ مشکل ترین حالات میں بھی کبھی پیدل اور کبھی سائیکل پر تبلیغ اور وعظ کے لیے تشریف نہ لے گئے ہوں۔

مولانا عرصہ دراز تک مرکزی جمعیت اہل حدیث ضلع گوجراں والا کے ناظم اور پھر امیر رہے۔

مولانا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنا کاروبار کرتے ہیں۔ مسلک اور جماعت کی خدمت فی سبیل اللہ کرتے ہیں۔ مقامی جماعت سے کبھی تنخواہ وغیرہ نہیں لی اور نہ کبھی تبلیغی پروگراموں کا کسی سے معاوضہ لیا۔

مولانا محمد رفیق سلفی صاحب کی محنت کا ثبوت راہوالی میں جماعت کی کثرت اور اس کا فعال ہونا ہے۔ کسی زمانے میں وہاں ایک مسجد کی تعمیر بھی مشکل تھی اور اب ماشاء اللہ وہاں میں سات مسجدیں ہیں، جن میں مستقل جمعہ و جماعت کا اہتمام ہے۔

مولانا محمد رفیق سلفی جماعت اہل حدیث کی ایک بڑی علمی و عملی شخصیت ہیں۔ ان کے حالات وواقعات مفصل لکھنے چاہئیں تا کہ نئی نسل جان سکے کہ ہمارے بزرگوں نے کن کھٹن حالات سے گزر کر دین اسلام کی تبلیغ کی ہے اور مسلک اہل حدیث کو قریہ قریہ پھیلایا ہے۔

فجزاهم الله احسن الجزاء عن سائر اهل الحديث

حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی کی تحریر ختم ہوئی۔ اب مولانا محمد رفیق سلفی کی زبانی مولانا احمد الدین کے چند مناظروں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ میں نے ان کے الفاظ میں کچھ ردوبدل کیا ہے۔

1۔ حضرت مولانا احمد الدین گکھڑوی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے علم وعمل کے ساتھ ساتھ زبردست قوت حافظہ سے نوازا تھا۔ کسی نے کسی مسئلے کے متعلق سوال کیا تو مولانا ایسا مدلل وشافی جواب دیتے کہ معلوم ہوتا مولانا کی سب سے زیادہ تحقیق ومطالعہ اسی مسئلے کے متعلق ہے۔

مولانا گکھڑوی اپنے والد محترم کے ساتھ لوہے کا کام کیا کرتے تھے۔ گکھڑ میں ایک شخص تھا، جن کا نام محمود بٹ تھا۔ خوب صورت اور صحت مند جوان، سخت مزاج، بریلوی مسلک کے پیروکار، مولانا احمد الدین اور مسلک اہل حدیث کے شدید ترین مخالف۔

محمود بٹ صاحب نے قریبی گاؤں نت کلاں میں عیسائیوں کے ساتھ کفارہ کے موضوع پر مناظرہ طے کر لیا اور شرائط میں یہ تحریر کیا گیا کہ اگر عیسائی ہار گئے تو نت کلاں کے تمام عیسائی مسلمان ہو جائیں گے اور اگر مسلمان ہار گئے تو گاؤں کے تمام مسلمان عیسائی ہو جائیں گے۔ ایک طرف بریلوی عالم دین مناظر تھے اور دوسری طرف عیسائی پادری۔ مناظرہ شروع ہوا تو محمود بٹ صاحب نے محسوس کیا کہ بریلوی علما سے بات بن نہیں رہی۔

معاملہ کچھ ایسی صورت اختیار کر گیا کہ انھیں حاضرین کی طرف سے کہا جانے لگا کہ یا تو عیسائی ہونے کی تیاری کر و یا پھر کوئی ایسا مناظر لاؤ جو اس میدان کا شاہ سوار ہو۔ چنانچہ وہ گکھڑ گئے اور مولانا احمد الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت مولانا نے بھٹّی گرم کی ہوئی تھی اور اپنے کام میں مصروف تھے۔ محمود بٹ نے کہا کہ مولانا نت کلاں مناظرے کے لیے جانا ہے ۔ ساری صورت حال سے آگاہ کیا اور کہا کہ اگر مسلمان عیسائی ہو گئے تو کوئی نہیں کہے گا کہ بریلوی عیسائی ہو گئے ۔ یہی کہا جائے گا کہ مسلمان عیسائی ہو گئے۔ مولانا نے اسی وقت اپنا کام چھوڑا اور ایک چھوٹی سی کتاب لی اور چل پڑے۔ محمود نے کہا حضرت وہاں بہت سی کتابیں عیسائیوں نے رکھی ہوئی ہیں اور ہمارے عالموں کے پاس بھی کتابوں کا ڈھیر ہے، لیکن کچھ نہیں بن رہا۔ یہ چھوٹی سی کتاب کیا کرے گی۔ مولانا نے فرمایا: اللہ تعالیٰ مدد کرے گا۔

نت کلاں پہنچ کر مولانا نے عیسائی مناظر سے پوچھا کہ مسئلہ کیا ہے اور مناظرے کا موضوع کیا ہے؟ انھوں نے بتایا کہ جناب! ہمارا دعویٰ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام صلیب پر چڑھ کر اپنی پوری امت کا کفارہ ہو چکے ہیں اور ہماری کتاب میں لکھا ہے کہ ہمیں ہر قسم کی تکلیف سے نجات ہوگئی ہے۔

مولانا نے عیسائی پادری کو مخاطب کر کے فرمایا میرے ہاتھ میں آپ کی کتاب مقدس کا یہ پرانا عہد نامہ ہے۔ اس کی پہلی کتاب پیدائش باب نمبر 2۔ آیت نمبر 6 ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ حضرت حوّا نے جب جنت میں ممنوعہ درخت کا پھل توڑ کر کھایا اور اپنے شوہر کو بھی دیا اور اس نے بھی کھایا۔ پھر خداوند خدا نے اس عورت سے کہا کہ میں تیرے درد حمل کو بہت بڑھاؤں گا اور تو درد سے بچہ جنے گی۔ (آیت نمبر 16) چنانچہ ثابت ہوا کہ آپ کی بائبل کے مطابق دانہ حوّا نے توڑا جس کے بدلے میں عورت کو ماہواری کا خون آتا ہے۔ سنو! عیسائیو! جس عورت کو ماہواری نہیں آتی، نہ اس کو حمل ہوتا ہے اور نہ دردِ زہ۔ تو پھر عیسیٰ علیہ السلام پوری امت کی طرف سے کفارہ کیسے ہو گئے کیوں بعض عیسائی عورتوں کو بھی ماہواری نہیں آتی۔ بعض کو حمل اور دردِ زہ نہیں ہوتا۔

معلوم ہوا کہ دردزہ اور حمل یا ماہواری کا تعلق دانہ کھانے سے نہیں اور نہ عیسیٰ علیہ السلام کفارہ ہوئے ہیں۔

پھر مسلمان عورتیں تو عیسیٰ علیہ السلام کو کفارہ مانتی ہی نہیں، ان کو بھی بسا اوقات دردِ زہ سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ اگر عیسیٰ علیہ السلام کفارہ ہو چکے ہیں اور آپ کا یہ گناہ معاف ہو چکا ہے تو پھر بچے کی پیدائش کے وقت عیسائی عورتوں کو تکلیف کیوں ہوتی ہے؟

معلوم ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام کفارہ نہیں ہوئے۔ لہٰذا آپ کا مذہب غلط ہے۔ یا میری اس بات کا جواب دو اور اپنے مذہب کو سچ ثابت کر دیا پھر وعدے مطابق مسلمان ہو جاؤ۔

جب عیسائی پادری اس اعتراض کا جواب نہ دے سکا تو مولانا نے محمود بٹ سے فرمایا

کہ محمود! میں نے اپنا کام کر دیا ہے۔اب آپ کی ذمہ داری ہے یا ان سے جواب لیں یا ان کو مسلمان بنائیں۔

اس کے بعد مولانا نے عیسائی پادری کو مخاطب کر کے کہا کہ جس مسئلے پر چاہو مناظرہ کر لو۔مگر عیسائی پادری کوئی جواب نہ دے سکے۔ چنانچہ تمام مسلمان خوشی سے اسلام زندہ باد...... مسلمان زندہ باد...... مولانا احمد الدین زندہ باد کے نعرے لگانے لگے۔

مولانا محمد رفیق سلفی فرماتے ہیں کہ اس مناظرے کی روداد مجھے حضرت مولانا احمد الدین رحمۃ اللہ علیہ کے بھائی فضل احمد نے سنائی جو میں نے امانت سمجھ کر پیش خدمت کر دی۔

2۔ اب دوسرا واقعہ سنیے!

ایک دفعہ گکھڑ میں پادری عبدالحق آئے۔انھوں نے رات کو منادی کرا دی کہ صبح 9 بجے جی ٹی روڈ اڈا گکھڑ میں عبدالحق پادری محفل قائم کرے گا۔ پورے گکھڑ کے مسلمان علما کو چیلنج ہے کہ جس مسئلے پر مناظرہ کرنا چاہیں عبدالحق پادری تیار ہے۔

اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ مولانا احمد الدین اس رات گھر میں موجود تھے اور شاید عبدالحق پادری کو اس کا علم نہیں تھا۔ چنانچہ صبح 9 بجے جب یہ محفل جم گئی تو مولانا احمد الدین صاحب ایک چھوٹا سا لوہے کا کیل اور بائیبل لے کر مجمعے میں پہنچ گئے۔لوگ مولانا کو دیکھ کر خوشی سے نعرے لگانے لگے۔مولانا نے فرمایا: پادری عبدالحق آپ نے مناظرے کا چیلنج کیا ہے؟ پادری عبدالحق نے کہا میں نے چیلنج کیا ہے۔

مولانا نے فرمایا: اصول مناظرہ یہ ہے کہ چیلنج کرنے والا سائل نہیں ہوتا۔لہٰذا سوال میرے ہوں گے اور جواب آپ دیں گے۔ پادری صاحب نے کہا ٹھیک ہے۔آپ سوال کریں، میں جواب دوں گا۔

پہلا سوال مولانا نے یہ کیا کہ آپ کا عقیدہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام تمام عیسائیوں کے

گناہوں کا کفار ہو چکے ہیں۔ کیا یہ درست ہے؟

پادری عبدالحق نے کہا: ہمارا یہی عقیدہ ہے۔

مولانا نے فرمایا: آپ کی بائیبل میں لکھا ہے کہ

جنت کے باغ سے دانہ حوا نے توڑا، خود کھایا اور خاوند کو کھانے کو دیا۔ دونوں نے شجر ممنوعہ سے کھایا، جس کی وجہ سے لباس اتر گیا اور خداوند خدا نے کہا تو نے میرے درخت کا خون بہایا، میں ہر ماہ تیرا خون بہاؤں گا اور دردِزہ بڑھاؤں گا۔

مولانا نے فرمایا: پادری صاحب سنیے! یہ ماہواری اور دردزہ کی تکلیف دانہ کھانے کے جرم میں ہے تو جن عیسائی عورتوں کو ماہواری نہیں آتی یا انھیں دردِزہ نہیں ہوتا کیا وہ حضرت حوا کی اولاد میں سے نہیں؟ اگر ہیں تو ان کو یہ تکلیف کیوں نہیں ہوتی؟

اور پھر اگر آپ کا یہ عقیدہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام آپ کے گناہوں کا کفارہ ہو گئے ہیں تو پھر عیسائی عورتوں کو یہ تکلیف کیوں ہوتی ہے؟

مسلمان عورتوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو کفارہ نہیں مانا وہ تو یہ تکلیف اٹھائیں لیکن عیسائی عورتیں کیوں اٹھاتی ہیں؟

معلوم ہوا کہ آپ کا یہ عقیدہ غلط ہے اور آپ کا مذہب باطل ہے۔ لہٰذا آپ کو تسلیم کرنا ہوگا کہ عیسائی اپنے اس عقیدے میں جھوٹے ہیں یا پھر میری اس بات کا جواب دو۔

عیسائی پادری عبدالحق اس کا کوئی جواب نہ دے سکے۔

دوسرا سوال مولانا نے یہ کیا کہ میرے ہاتھ میں یہ انجیل متی ہے۔ اس کے صفحہ 21 باب نمبر 17 آیت نمبر 20 میں لکھا ہے کہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اگر تم ایمان رکھو اور شک میں نہ پڑو تو پھر اگر اس پہاڑ سے بھی کہو گے کہ تو اکھڑ جا اور سمندر میں جا گر تو ایسا ہی ہو جائے گا۔

ان آیتوں میں ایمان کا ذکر ہے اور اگر رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہو تو آپ

کے کہنے پر پہاڑ بھی سرک کر دوسری جگہ چلا جائے گا۔

اب میں (احمد الدین) پوچھتا ہوں کہ آپ ایمان دار ہیں یا نہیں؟

پادری عبدالحق نے جواب دیا: میں ایمان دار ہوں۔

مولانا احمد الدین صاحب نے جیب سے ایک چھوٹا سے کیل نکالا اور فرمایا پادری صاحب اس کا سائز صرف ایک انچ ہے (یعنی کوئی اتنا وزنی نہیں) اس کیل کو اپنی قوت ایمانی سے اپنی طرف کھینچیے۔ اگر آپ اپنی ایمانی قوت سے کھینچ کر اسے اپنے پاس لے گئے تو آپ ایمان دار۔ اگر نہ لے جاسکے تو ایمان دار نہیں ہوں گے۔

مولانا نے فرمایا: پادری عبدالحق! یاد رکھیے میرا نام احمد الدین گکھڑوی ہے اور اس سے پہلے آپ کے ساتھ جلیاں والا باغ (امرتسر) میں کفارے کے موضوع پر مناظرہ کر چکا ہوں۔ اگر آپ کو معلوم ہوتا کہ احمد الدین گکھڑ میں ہے تو آپ کبھی مناظرے کی منادی نہ کراتے۔

یہ واقعہ مولانا گکھڑوی کے بھتیجے محمد یوسف نے سنایا اور بتایا کہ

عبدالحق پادری میدان چھوڑ کر چلے گئے اور مولانا سے مقابلے کی جرأت نہ کر سکے۔

3۔ تیسرا واقعہ: جنوری 1964ء میں راہوالی کی مرکزی جامع مسجد اہل حدیث کی تعمیر شروع تھی۔ ایک شخص مستری ابراہیم ان دنوں مسجد میں کام کر رہے تھے۔ ان کا تعلق ٹھٹھہ چھینہ سے تھا۔

حافظ محمد یوسف گکھڑوی مرحوم جب کبھی شہر سے باہر جاتے تو خطبہ جمعہ کے لیے مولانا محمد رفیق سلفی کو حکم دیتے اور وہ گکھڑ میں حافظ صاحب کی مسجد میں (جو انھوں نے اپنے مکان کے اوپر بنائی تھی) خطبہ ارشاد فرماتے۔ ایک مرتبہ حافظ صاحب کے حکم کے مطابق جنوری 1964ء کو مولانا رفیق سلفی صاحب جمعہ پڑھا رہے تھے کہ مولانا احمد الدین صاحب آ کر مسجد میں بیٹھ گئے۔ نماز جمعہ کے بعد مولانا رفیق صاحب نے عرض کیا کہ حضرت آپ پہلے

تشریف لاتے تو آپ خطبہ ارشاد فرماتے۔ فرمایا: آج میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں آپ کا خطبہ سنوں۔

اس کے بعد فارغ ہو کر جب مولانا محمد رفیق صاحب سائیکل پر واپس راہوالی آئے تو مستری ابراہیم نے ان سے پوچھا کہ آج مولانا احمد الدین صاحب کہاں ہوں گے؟ مولانا نے بتایا کہ آج گکھڑ میں موجود ہیں۔ مستری صاحب نے کہا کیا وہ آج ہمارے گاؤں ٹھٹھہ چھینہ چلے جائیں گے؟ وہاں چار پانچ روز سے سیالکوٹ سے ایک پادری آئے ہیں اور وہ روزانہ چیلنج کرتے ہیں کہ کوئی مسلمان جس مسئلے پر چاہے میرے ساتھ مناظرہ کرلے۔

مولانا رفیق سلفی صاحب اسی وقت واپس گکھڑ گئے اور مولانا احمد الدین صاحب سے بات کی تو مولانا فرمانے لگے پادری چیلنج کرتا ہے تو چلو اسی وقت چلتے ہیں۔ وہ کیا یاد کرے گا۔ چنانچہ مغرب کے وقت وہ ٹھٹہ چھینہ میں پہنچ گئے۔

مولانا نے مغرب کے بعد نمازیوں سے کہا کہ پادری کے سامنے کوئی شخص مجھے مولوی یا مولانا نہ کہے بلکہ باباجی کہے۔ عشا کی نماز کے بعد پادری کے پاس گئے اور ان سے گفتگو شروع ہوئی تو کسی نے مولانا احمد الدین صاحب کو مولانا کہہ کر بلایا۔ اب پادری اس بات پر بضد ہو گیا کہ مجھے بتایا جائے یہ مولانا کون ہیں؟

مولانا فرمانے لگے کہ پادری صاحب کیا آپ ہر روز چیلنج نہیں کرتے کہ جو مسلمان چاہے میرے ساتھ مناظرہ کرلے۔ اب آپ کو کیا غرض کہ میں کون ہوں۔ میں آ گیا ہوں۔ آپ مناظرہ کریں اور اپنی صداقت ثابت کریں۔ لیکن پادری صاحب اصرار کرنے لگے کہ پہلے مجھے بتایا جائے آپ کا نام کیا ہے اور آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟

مولانا فرمانے لگے میرا نام احمد الدین ہے اور میں گکھڑ سے آیا ہوں۔ بس یہ سننا تھا کہ پادری صاحب نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے اور معافی مانگنے لگے کہ میں آپ سے مناظرہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا، نہ مجھے زیادہ علم ہے۔ مجھے معاف کر دیجیے۔ آئندہ میں کسی

مسلمان کو مناظرے کا چیلنج نہیں کروں گا۔

مولانا محمد رفیق سلفی فرماتے ہیں کہ مولانا احمد الدین مناظرے میں ایسی شمشیر برہنہ تھے، جسے نہ کوئی توڑ سکا اور نہ نیام داخل کرا سکا، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنے پاس بلا لیا۔

اللهم اغفر له وارحمه وادخله جنة الفردوس.

مولانا محمد رفیق سلفی صاحب نے ان کا ایک اور واقعہ بیان کیا۔

یہ واقعہ مولانا حافظ عبدالقادر روپڑی مرحوم نے ان کو بتایا تھا۔ وہ یہ کہ وہ اور مولانا احمد الدین کہیں سے لاہور آئے تو مولانا احمد الدین فرمانے لگے لاہور میں میرا ایک دوست ہے، جسے میں ملنا چاہتا ہوں۔ وہ شخص منکر حدیث تھا۔ حافظ عبدالقادر صاحب فرماتے ہیں کہ ہم دونوں اس شخص کے پاس گئے تو اس نے ایک نوجوان کو کہا کہ جاؤ دو گلاس شربت لاؤ اور ساتھ ہی دو آنے کی پسی ہوئی سرخ مرچ بھی لانا۔

مولانا احمد الدین صاحب نے اس نوجوان کو مخاطب ہو کر فرمایا۔ ایک چھتر (پرانا جوتا) بھی لیتے آنا۔ وہ منکر حدیث کہنے لگا چھتر کا آپ نے کیا کرنا ہے؟ مولانا نے فرمایا شربت کے ساتھ تم نے سرخ مرچ کیوں منگوائی ہے؟ اس نے کہا میں نے مرچ اس لیے منگوائی ہے کہ جب آپ شربت پئیں گے تو وہ مرچیں میں آپ کے سامنے اڑاؤں گا۔ پھر آپ کو چھینکیں آئیں گی اور آپ الحمدللہ کہیں گے تو آپ کو ثواب ملے گا۔

مولانا احمد الدین نے فرمایا: میں نے چھتر اس لیے منگوایا ہے کہ جب تو یہ مرچیں ہمارے سامنے اڑائے گا تو تیری اس شرارت پر ہم تجھے جوتے ماریں گے اور تو صبر کرے گا تو تجھے ثواب ملے گا۔

حافظ عبدالقادر روپڑی کی روایت سے مولانا محمد رفیق سلفی کا بیان کردہ واقعہ ختم ہوا۔

اس واقعہ میں جو اجمال پایا جاتا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ حدیث شریف میں آتا ہے، جس شخص کو چھینک آئے وہ الحمدللہ کہے۔ وہ شخص چوں کہ حدیث کو نہیں مانتا تھا، اس

لیے اس نے طنزاً کہا کہ مرچ کا اثر آپ کی ناک تک پہنچے گا تو آپ کو چھینک آئے گی اور آپ حدیث کی رو سے الحمد للہ کہیں گے تو مستحق اجر قرار پائیں گے...... مولانا نے اس کو جو چھتر مارنے کے متعلق فرمایا، اس کا پس منظر یہ ہے کہ منکرینِ حدیث کہتے ہیں کہ قرآن کے سوا کسی چیز کو نہیں ماننا چاہیے۔ قرآن میں چوں کہ صبر کی تلقین فرمائی گئی ہے اور ارشاد ہے کہ ''ان اللہ مع الصابرین'' اس پر چھتر پڑیں گے تو وہ صبر کرے گا اور اسے ثواب حاصل ہوگا۔ یعنی منکر حدیث نے جو طنز آمیز بات کی، مولانا احمد الدین نے قرآن کے الفاظ پڑھ کر اس کا جواب دیا۔

تاریخ اسی قسم کے واقعات کا نام ہے۔ جس شخص سے ان واقعات کا تعلق ہو، اس کے متعلق پتا چلتا ہے کہ علم و عمل میں اس کا کیا مقام تھا اور اس کی بات چیت کا کیا انداز تھا، مجلس میں وہ کس طرح پیش آتا تھا اور اس کے کس قسم کے لوگوں سے مراسم تھے۔

مولانا احمد الدین گکھڑوی چوں کہ عالم دین تھے اور مناظرانہ ذہن رکھتے تھے، اس لیے گفتگو میں عام طور پر ان کے اس ذہن کی عکاسی ہو جاتی تھی اور جو لوگ اس فن سے دلچسپی رکھتے ہیں، وہ ان کی اس قسم کی باتوں سے خوش ہوتے تھے۔ مناظر کسی سے کوئی بات کرے تو وہ آسانی سے سمجھ جاتا ہے کہ اس کا مخاطب کس ذہن کا مالک ہے اور اس سے کس اسلوب سے بات کرنی چاہیے۔

مولانا محمد رفیق سلفی سے مولانا احمد الدین کے مراسم رہے تھے، اس لیے انھیں ان کے ان واقعات کا علم ہے جو ان کے سامنے رونما ہوئے۔ ہم ان کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے حافظ فاروق الرحمٰن یزدانی کی وساطت سے ان واقعات کی اطلاع دی۔

☆☆☆

تیئیسواں باب

وفات

حضرت مولانا احمدالدین گکھڑوی کی وفات پر عیسوی حساب سے سینتیس (37) برس کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اس وقت گکھڑ کی مسجد اہل حدیث یعنی مسجد توحید گنج کے خطیب وامام مولانا عبدالواحد تھے۔ مولانا احمدالدین مرحوم کی وفات پر ہفت روزہ ''الاعتصام'' کے 6۔ جولائی 1973ء کے شمارے میں ان کا مضمون شائع ہوا تھا، جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ وہ مولانا مرحوم کے مختلف مناظروں کی روداد جمع کر رہے ہیں، جسے مرتب کر کے وہ ''الاعتصام'' میں شائع کرائیں گے، لیکن افسوس ہے، وہ بھی عرصہ ہوا وفات پا گئے۔ معلوم نہیں، ان کے مناظروں کے متعلق انھیں تفصیلات کا علم ہوا یا نہیں ہوا۔ اندازہ یہ ہے کہ انھیں اس سلسلے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں ہوسکیں۔ اگر حاصل ہوتیں تو ''الاعتصام'' میں ضرور شائع کی جاتیں۔

بہر حال ان کا 6۔ جولائی 1973ء کا مضمون یہاں درج کیا جا رہا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

''جماعت اہل حدیث کے نامور خطیب، مایۂ ناز مقرر، مشہور اور کامیاب مناظرِ اسلام حضرت مولانا احمد الدین گکھڑوی مورخہ 12۔ جمادی الاولی 1393ھ (مطابق 14۔ جون 1973ء) کو بروز جمعرات بوقت چار بجے دن وفات پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ آپ کی وفات ملتِ اسلامیہ کے لیے اور خصوصاً طائفۂ منصورہ اہل سنت والجماعت یعنی اہل حدیث کے لیے نا قابلِ تلافی المیہ ہے۔ کون سا شخص ہے جو آپ کی

وفات سے محزون اور کون سا ایسا دل ہے جو آپ کی وفات سے مغموم نہیں۔ جب آپ کا جنازہ پڑھا جا رہا تھا تو راقم الحروف نے خود دیکھا کہ سیکڑوں آنکھیں فرطِ غم سے اشک بار تھیں اور لوگ ہچکیاں اور سسکیاں بھر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی بشری کوتاہیوں کو معاف کرے اور انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

''مولانا احمد الدین کے والد ماجد کا نام حاجی اللہ دتا تھا جو حداد برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ اپنے ننھیال کے ہاں مقام جھاں والا میں 1900ء میں پیدا ہوئے۔ ''جھاں والا'' (تحصیل وزیر آباد ضلع گوجراں والا) میں ایک گاؤں ہے۔ مولانا نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے والد صاحب کے ساتھ گکھڑ (ضلع گوجراں والا) میں اپنے آباو اجداد کی صنعت سیکھ لی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں شروع سے ہی کام کرنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ سستی وکاہلی سے نفرت تھی۔ چنانچہ مولانا مرحوم نے اپنی آبائی صنعت میں اچھی خاصی مہارت حاصل کر لی، اور اس کے ساتھ ساتھ دل میں حصولِ تعلیم کا شوق پیدا ہوا۔ محنت و مزدوری کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کے حصول میں بھی پوری دلچسپی لینی شروع کر دی۔ ذہانت، حافظہ، بیدار مغزی اور مستقل مزاجی یہ وہ خداداد اوصاف تھے جو ان میں پائے جاتے تھے۔ حصولِ تعلیم کا شوق روز بروز بڑھتا گیا، یہاں تک کہ پوری توجہ علوم وفنون کے حصول کی طرف ہوگئی۔

''ایامِ طفولیت میں ہی کتب ہائے فارسی خصوصاً ''کریما''، (شیخ عطار)، ''گلستان وبوستان'' مکمل اور ''سکندر نامے'' کے دیباچے تک کا علم استاذِ مکرم میاں محکم دین مرحوم سے حاصل کیا۔ بعد ازاں سید محمد حسین سے ابواب الصرف کے تمام ابواب یاد کیے۔ صرف بہائی، صرف میر، زنجانی اور مراح الارواح کتابیں بھی استاذ مذکور سے پڑھیں۔ اس کے بعد موضع ''نت کلاں'' جا کر ایک خاموش قسم کے جید عالم دین (حضرت مولانا سلطان احمد

مرحوم) سے ہدایۃ النحو ، کافیہ، الفیہ مع ابن عقیل وغیرہ کتب پڑھیں۔ مولانا احمد الدینؒ کے حالات سے واقف لوگ ضرور اس کی تائید کریں گے کہ مولانا ممدوح گھر پر اپنا کام کرتے تھے اور گرمی کی شدت میں سر پر کپڑا باندھ کر روزانہ پیدل ''نت کلاں'' جاتے اور مولانا سلطان احمد مرحوم سے علم حاصل کرتے رہے۔ چنانچہ مذکورہ کتب پڑھنے کے بعد مولانا سلطان احمدؒ ممدوح سے انھوں نے مشکوٰۃ شریف، کتب صحاح ستہ (بخاری' مسلم' ترمذی' نسائی' ابوداؤد' ابن ماجہ) پوری توجہ اور انہماک سے سبقاً سبقاً پڑھیں۔ حصولِ تعلیم کے وقت ان کی عمر پندرہ سال کی تھی۔ لیکن افسوس کہ سولھواں سال باعثِ غم وحزن تھا، جب کہ ان کے والد ماجد ساٹھ سال کی عمر میں داغِ مفارقت دے گئے۔ اگر چہ اس عمر میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانے سے انسان پر رنج وغم کے پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں، مگر وہ اللہ تعالیٰ کی رضا پر راضی رہے، پائے ثبات میں لغزش نہ آئی اور حصولِ علم میں برابر کوشاں رہے۔

''یہ مرحلہ طے کرنے کے بعد گوجراں والا جا کر مولانا علاؤالدین سے تین مہینے ترمذی اور ابوداؤد کا سبق لیتے رہے۔ واپس آکر دوبارہ مولانا سلطان احمد (نت کلاں) سے بعض کتب صحاح دوبارہ پڑھیں۔ ان کتب کے علاوہ منطق کے رسائل، ایساغوجی، قال اقول، میر ایساغوجی اور مرقات وغیرہ مولانا موصوف سے پڑھیں۔

''یہ منازل طے ہوئیں تو ان کی خداداد قوتیں یوں اجاگر ہوئیں کہ انھیں مختلف مقامات پر تقریروں کے لیے مدعو کیا جانے لگا، جس میں اللہ تعالیٰ نے انھیں بے حد کامیابی عطا فرمائی۔ دلائل کے اعتبار سے ان کی تقریر اتنی ٹھوس ہوتی تھی کہ ان کا شہرہ دور تک پھیل گیا۔ جس جلسے میں شریک ہوتے، اس کی کامیابی کا سہرا ان کے سر بندھتا۔ اسی زمانے میں انھوں نے محدثِ دوراں حضرت مولانا حافظ عبداللہ روپڑی سے شرح تہذیب پڑھی۔ بعد ازاں حضرت مولانا شریف اللہ خاں صاحب (سابق مدرس مدرسہ رحمانیہ دہلی، مدرسہ تقویۃ الاسلام لاہور اور جامعہ سلفیہ فیصل آباد) سے سلم العلوم اشکال اربعہ تک پڑھی۔ اس کے علاوہ

بھی بہت سی درسی کتابیں مختلف اوقات میں پڑھ لیں۔غرض اس طرح انھوں نے تقریباً تمام فنون کے ضروری حصوں پر عبور حاصل کر لیا۔

''برصغیر کی مذہبی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کو معلوم ہے کہ 1947ء (تقسیم ہندوستان) تک مذہبی اور تبلیغی لحاظ سے متحدہ ہندوستان میں مناظرات کا دور دورہ تھا، جس کے بغیر اس وقت کوئی چارہ کار نہ تھا۔ جماعت اہل حدیث میں اس کی سربراہی کا سلسلہ حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری کے سپرد تھا یا پھر ان کے بعد حضرت مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی تھے۔

''بیسویں صدی عیسوی کے تیسرے عشرے 1920ء میں ہمارے مولانا احمد الدین بھی عین عالم جوانی میں مناظرین و مبلغین کی اس جماعت میں شامل ہو گئے۔ چنانچہ اسلام سے باہر اور مسلمانوں کے اندر ہر فرقے کے مناظرین سے انھیں سابقہ پڑا اور تقریباً ہر مناظرے میں کامیابی حاصل کی۔ان مختلف موضوعات پر جو اس زمانے میں مناظرات کے ہوتے تھے، مولانا احمد الدین کی تقریریں بہ اعتبار ٹھوس دلائل اپنے سب معاصرین پر فائق اور طرزِ بیان میں بہت دلچسپ ہوا کرتی تھیں، اور پھر یہی انداز تا حین حیات رہا۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

''مناظرات اور مناظرانہ تقریروں میں سرفہرست مرزائیت کے پیدا کردہ جو موضوع تھے، وہ تھے حیات مسیح، ختم نبوت، صداقت مرزا، کذباتِ مرزا وغیرہ۔ان عنوانوں میں سے ہر عنوان پر مرزائیوں کے بہت سے مبلغوں سے مولانا احمد الدین کے نہایت کامیاب مناظرے ہوئے۔

''ان مبلغوں میں اللہ دتا (حال ابوالعطا جالندھری ربوہ) آں جہانی، غلام رسول (راجیکی) محمد یار، سعد الدین، عبداللہ مبشر خصوصاً ملک عبدالرحمٰن گجراتی مصنف ''احمدیہ

پاکٹ بک'' وغیرہم شامل تھے۔ آخرالذکر بڑا منہ پھٹ مرزائی مناظر تھا۔

''مرزائیوں کے علاوہ، عیسائیوں سے بھی ان کے بہت سے مناظرے ہوئے۔ عیسائیت پر ان کا مطالعہ جس قدر وسیع تھا، اس پر آپ کی وہ تالیفات شاہد ہیں جو اکثر شائع ہو چکی ہیں۔ ایسے ہی بریلوی حنفی حضرات سے ان کے دل پسند مسائل پر بڑے مدلل مناظرے ہوتے تھے۔ علاوہ ازیں دیوبندی علمائے کرام سے بھی اختلافی مسائل پر ان کی مناظرانہ چھیڑ چھاڑ رہتی تھی۔ مناظروں میں مولانا احمد الدین کی یہ منفرد خصوصیت ہر جگہ نمایاں رہی کہ جو بات کرتے تھے وہ ٹھوس، وزنی اور بادلیل ہوتی تھی۔

''ظاہر ہے ان سب مناظروں کی پوری روداد یں تو اب مہیا ہونی مشکل ہیں، تاہم جن مناظروں کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوئی ہیں، ان کو یہ راقم اپنے الفاظ میں صفحۂ قرطاس پر لانے کی کوشش کرے گا۔

''مولانا مرحوم جہاں میدانِ مناظرہ کے شہسوار تھے، وہاں ذوقِ تحریر سے بھی کافی حد تک بہرہ ور تھے، جس پر ان کی تالیفات شاہد عدل ہیں۔ ان تالیفات میں جن کا پتا چل سکا ہے، مندرجہ ذیل ہیں۔

1۔ سیرت سید العالمین: یہ کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل پر جامع اور مدلل کتاب ہے۔

2۔ برہان الحق بجواب میزان الحق (عیسائیوں کی تردید میں)

3۔ نجات الاسلام (عیسائیوں کے رد میں)

4۔ تقدیس سید الابرار

5۔ قدامت اہل السنۃ والجماعت یعنی اہل حدیث: یہ سب تالیفات شائع ہو چکی ہیں اور سکول بک ڈپو اردو بازار گوجراں والا سے مہیا بھی ہو سکتی ہیں۔

''آپ کی عیسائیوں کے رد میں ایک اور تالیف بھی ہے جسے مولانا عطاء اللہ حنیف

بھوجیانی کے ایما پر تالیف کیا گیا اور جو پادری ٹھاکر داس کی رسوائے زمانہ کتاب امہات المؤمنین کے جواب میں ہے۔اس کا آپ نے نام تجویز فرمایا تھا:"ضربات المسلمین علی راس الطاعین فی شان امهات المؤمنین"۔اس کتاب کومولانا نے املا کرایا تھا اور املا کی سعادت راقم الحروف کو حاصل ہوئی۔ اس تالیفِ لطیف کا مسودہ تھوڑے دن ہوئے تکمیل ہو کر لاہور مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی دامت برکاتہ کے ہاں پہنچ چکا ہے۔اسے وہ جلد ہی شائع کرنے کا ارادہ کررہے ہیں۔اللہ کرے کہ جلد طبع واشاعت کے مراحل طے ہوں۔

"اب مولانا کا ارادہ تھا کہ عصمت انبیاء علیہم السلام کے موضوع پر"عصمت نامہ" کے نام سے ایک کتاب لکھیں گے،جس کا آغاز فرمادیا تھا تا آنکہ اسی جہاد فی سبیل الاسلام میں اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کردی۔ اللهم الحقه بالرفيق الاعلیٰ فاجعل جنة الفردوس مثواه وادخله في عبادک الصالحين."

مولانا عبدالواحد مرحوم ومغفور کی تحریر ختم ہوئی، جو آج سے سینتیس (37) سال پہلے 6۔جولائی 1973ء کے"الاعتصام"میں شائع ہوئی تھی۔اس تحریر سے بہت سی پرانی یادیں تازہ ہوئیں۔انھوں نے مولانا احمد الدین کے ایک مسودے کا بھی ذکر کیا ہے،جس کا نام "ضربات المسلمين على رأس الطاعين في شان امهات المؤمنين"تھااور وہ پادری ٹھاکر داس کی کسی کتاب کے خلاف تھا۔مولانا مرحوم نے وہ مسودہ انھی مولانا عبدالواحد سے املا کرایا تھا۔مسودہ کتابی شکل میں چھپوانے کے لیے حضرت مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کی خدمت میں لاہور بھجوادیا گیا تھا......معلوم نہیں مسودہ کتنے صفحات پر مشتمل تھا۔وہ مسودہ شائع نہیں ہوا۔یہ بھی معلوم نہیں ہوسکا کہ سینتیس (37) برس قبل کا وہ مسودہ اب کہاں ہے اور کس حال میں ہے یا کہیں گم ہوگیا ہے۔

اب مولانا احمد الدین گکھڑوی کے متعلق مولانا محمد سلیمان انصاری کا مضمون

پڑھیے۔ یہ مختصر سا مضمون ''آہ! مولانا احمد الدین'' کے عنوان سے 27۔ جون 1973ء کے ''الاعتصام'' میں چھپا تھا۔

مولانا محمد سلیمان انصاری اس وقت ''الاعتصام'' کے عملہ ادارت کے رکن تھے۔ وفات سے چند روز پیشتر مولانا احمد الدین مرحوم نے خاص طور سے خط لکھ کر انھیں گکھڑ بلایا تھا اور فرمایا تھا کہ آپ سے ملنے کو بڑا جی چاہ رہا تھا۔

مولانا محمد سلیمان انصاری نے 30۔ اگست 1998ء کو وفات پائی۔

اناللہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا محمد سلیمان انصاری لکھتے ہیں:

''ضلع گوجراں والا کے مردم خیز خطے کو ہمیشہ یہ فخر رہا ہے کہ یہاں بہت سے اعاظم رجال پیدا ہوئے۔ انہی میں سے ایک مولانا احمد الدین صاحب گکھڑوی تھے جو مولانا محمد اسماعیل سلفی، مولانا عبدالمجید سوہدروی اور مولانا نور حسین گھر جاکھی رحمۃ اللہ علیہم کے تبلیغی رفیق کار اور اس سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی تھے، اور آخر ایک طویل عرصے تک بیمار رہ کر راہی ملک عدم ہو گئے۔ اناللہ وانا اللہ راجعون۔

''مورخہ 14۔ جون (1973ء) کو بروز جمعرات مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی ایک ضروری کام سے گوجراں والا تشریف لے گئے تو مولانا حافظ محمد یوسف صاحب گکھڑوی کے ہاں سے یہ روح فرسا خبر ملی کہ مولانا احمد الدین گکھڑوی آج تقریباً چار بجے وفات پا گئے ہیں۔ حافظ صاحب موصوف نے فرمایا کہ میرے گکھڑ جانے پر جنازے کا پروگرام بنایا جائے گا۔ مولانا نے مشورہ دیا کہ بہتر ہو گا جنازہ بروز جمعہ بعد نماز عصر پڑھا جائے تا کہ مولانا کے دور دراز کے عقیدت مند بھی شریکِ جنازہ ہو سکیں۔

'' واپسی پر مولانا عطاء اللہ صاحب راقم کے ہاں مصری شاہ تشریف لائے اور ہم دونوں نو بجے رات میاں عبدالمجید صاحب کی کوٹھی پہنچے، تا کہ فون کے ذریعے احباب کو

اطلاع پہنچا دی جائے۔ ادھر مولانا حافظ محمد یوسف صاحب نے فون پر میاں عبدالمعید صاحب کو بتا دیا کہ جنازہ جمعے کے دن بعد نماز عصر ہوگا۔ چنانچہ ہم نے شیخ محمد اشرف، میاں فضل حق وغیرہ سے فون پر رابطہ پیدا کر کے بہت سے احباب کو پروگرام سے مطلع کر دیا۔ شیخ محمد اشرف صاحب نے روز ناموں میں بھی خبر بھیج دی۔ میاں عبدالمعید صاحب نے لائل پور، راولپنڈی، سیالکوٹ، اوکاڑہ اور جہاں تک ہو سکا دیگر مقامات میں اطلاعات دے دیں اور جمعے کے دن صبح راقم نے لاہور کی تقریباً سب مساجد میں اطلاع دے دی تاکہ خطبوں میں اعلان ہو سکے۔ چنانچہ مقررہ وقت پر ہزاروں کی تعداد میں احباب جماعت اور دیگر حضرات نے مولانا کے جنازے میں شرکت فرمائی۔

''مولانا احمدالدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کئی ماہ سے صاحبِ فراش تھے۔ آپ کی وفات سے علمی حلقوں میں جو خلا پیدا ہوا ہے، اس کا پُر ہونا بہ ظاہر مشکل نظر آتا ہے۔ مولانا مرحوم کی وفات جماعت اہل حدیث کے لیے ایک عظیم سانحہ ہے۔ وہ بہترین خطیب، اچھے مدرس اور کامیاب مناظر تھے۔ ان کا استدلال اتنا زوردار ہوتا تھا کہ مدمقابل اسے توڑ نہیں سکتا تھا۔ ان کے مناظرے عیسائیوں، آریوں، مرزائیوں، منکرین حدیث، مقلدین وغیرہ سب سے ہوئے۔ مولانا کو توحید و سنت سے انتہائی محبت اور شرک و بدعت سے شدید نفرت تھی۔ ان کی حق گوئی و بیباکی ضرب المثل تھی۔ مداہنت اور مصلحت اندیشی کے یکسر خلاف تھے۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ کسی ایک جگہ جم نہ سکے اور اپنی سیمابی طبیعت کے باعث اس شعر کا مصداق رہے۔

جہاں میں اہل ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

''مولانا مرحوم نے فرمایا تھا کہ وہ تعلیمی مراحل طے کر کے حضرت مولانا ثناء اللہ امرتسری کی خدمت میں امرتسر گئے اور مولانا امرتسری مرحوم کی جوہر شناسی نے مس خام کو

کندن بنا دیا۔ تفصیلی حالات تو مولانا کے ہم عصر بزرگ ہی بتا سکتے ہیں، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نور حسین گھرجاکھی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا احمد الدین صاحب کی تبلیغی جوڑی مولانا امرتسری نے ہی ترتیب دی تھی، جس نے مسلکی میدان میں پورے ہندوستان میں اپنی تقریروں اور مناظروں سے تہلکہ مچا دیا۔ مولانا گھرجاکھی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد تو حقیقت یہ ہے کہ مولانا احمد الدین صاحب بجھے بجھے سے رہتے تھے۔

''مولانا مرحوم نے وفات سے ایک ہفتہ قبل راقم کو خط لکھا کہ تم آ کر مل جاؤ۔ چنانچہ حسب الحکم بندہ حاضر ہوا اور عرض کی حضرت آپ نے کیسے یاد فرمایا؟ فرمانے لگے کہ میری عمر کے آخری ایام میں تم نے جس اخلاص کا ثبوت دیا ہے، میرا بار بار ملنے کو جی چاہتا تھا۔ دل اداس تھا۔ تمہیں خط لکھوا دیا۔ تم آ گئے، طبیعت کو سکون ہو گیا۔ **فالحمد لله علیٰ ذالک.**

''مختلف باتیں ہوئیں۔ علماء کی نئی پود کا شکوہ فرماتے رہے کہ علم کی طرف کم توجہ دیتے ہیں اور ہم ایسے لوگوں سے استفادہ نہیں کرتے، حالاں کہ ہماری باتیں ہمارے جانے کے بعد انہی کے کام آنے والی ہیں۔

''یہ راقم کی ان سے آخری ملاقات تھی۔ فرمانے لگے، مولانا محمد عطاء اللہ حنیف ہماری جماعت کے بہت بڑے محقق و مدبر عالم ہیں، کاش کہ ان کی خدمات سے جماعت متمتع ہوتی، لیکن چند جاہ پسندوں کی وجہ سے جماعت جس موڑ پر پہنچ گئی ہے، وہ نہایت قابل افسوس ہے۔

''راقم الحروف اجازت لے کر واپس آنے لگا تو فرمانے لگے مولانا محمد عطاء اللہ صاحب کی خدمت میں میرا بہت بہت سلام عرض کرنا اور درخواست دعا بھی...... میں آخری سلام عرض کر کے رات کو لاہور واپس آ گیا اور تقریباً آٹھ دن کے بعد آپ کی وفات کی خبر آ گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔''

مولانا محمد سلیمان کی تحریر قارئین ذی اکرام نے پڑھ لی۔

واقعہ یہ ہے کہ مولانا احمد الدین کا جنازہ گکھڑ کی تاریخ کا بہت بڑا جنازہ تھا۔ مولانا

مرحوم کے بھتیجے مرزا محمد یونس نے ایک خط میں بتایا کہ مولانا کا جنازہ ڈی، سی ہائی سکول کی فٹ بال گراؤنڈ میں حافظ محمد یوسف گکھڑوی نے پڑھایا تھا۔ پوری گراؤنڈ لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ گکھڑ کی تاریخ کا یہ سب سے بڑا جنازہ تھا۔ جنازے میں لوگوں کا اتنا بڑا ازدحام دیکھ کر ہماری گلی کے ایک شخص چودھری نذر احمد پٹواری جو مولانا کے ہم عمر تھے، اونچی اونچی رو رہے تھے اور کہہ رہے تھے: احمدالدین! سانوں تاں پتا آج لگا اے کہ توں کی ایں۔

(احمدالدین ہمیں تو آج پتا چلا ہے کہ تم کتنے بڑے آدمی ہو)

یہی مرزا محمد یونس مولانا احمدالدین کی کتابوں کے متعلق بتاتے ہیں کہ مولانا کی وفات کے بعد ان کی تمام کتابیں ہماری تایازاد بہن لے گئی تھی، جس کی شادی گوجراں والا کے ایک امیر گھرانے میں ہوئی۔ اس کے سسرال والوں نے اپنے کارخانے کے قریب حافظ آباد روڈ پر مسجد مبارک کے نام سے مسجد تعمیر کرائی ہے۔ وہ کتابیں اس مسجد میں رکھ دی گئی ہیں اور وقف ہیں۔ جو شخص چاہے، وہاں بیٹھ کر ان سے استفادہ کرسکتا ہے۔ اس طرح یہ کتابیں مولانا مرحوم کے لیے صدقۂ جاریہ ہیں۔

بہت اچھا ہوا کہ مولانا احمدالدین گکھڑوی مرحوم و مغفور کی کتابیں ایک مسجد میں رکھ دی گئی ہیں اور وقف کر دی گئی ہیں۔ لیکن مسجد میں کتابوں کا محفوظ رہنا بالعموم مشکل ہوتا ہے۔

مولانا احمدالدین امیر آدمی نہیں تھے۔ انھوں نے اپنا پیٹ کاٹ کر بے حد ناموافق حالات میں کتابیں خریدی ہوں گی۔ ان کی حفاظت کرنا نہایت ضروری ہے۔ ایسا نہ ہو کہ لوگ کتابیں لے جائیں اور پھر واپس نہ کریں۔ مسجد کے متولیوں کا فرض ہے کہ وہ مولانا مرحوم کے اس علمی سرمایہ کی ہر قیمت پر حفاظت کریں۔ اگر ان میں سے ایک کتاب بھی ضائع ہوگئی تو اللہ کے دربار میں مسجد کے متولیوں سے اس کے متعلق پوچھا جائے گا۔ یہ بہت بڑی امانت ہے، اس کی حفاظت انتہائی ضروری ہے۔ بلکہ مسجد کے متولیوں کو چاہیے کہ مختلف موضوع کی کتابیں خرید کر مولانا مرحوم کے وقف شدہ کتب خانے میں اضافہ کریں۔

چوبیسواں باب

مولانا گکھڑوی علیہ الرحمہ کے دو خواب

(حافظ محمد یوسف گکھڑوی کا مکتوبِ گرامی مولانا عطاء اللہ صاحب کے نام)

مولانا حافظ محمد یوسف گکھڑوی مشہور عالم دین اور معروف خطیب تھے۔ بے حد مخلص، پُر جوش مبلغ و واعظ اور بلند اخلاق بزرگ۔ ان کا مولد و مسکن موضع گکھڑ (ضلع گوجراں والا) تھا۔ گزشتہ صفحات میں متعدد مرتبہ ان کا نام آیا ہے۔ وہ مولانا احمد الدین کے قریب تریں رفیق تھے، ان کے حلقۂ شاگردی میں بھی رہے۔ حضرت مولانا محمد علی لکھوی سے چینیاں والی مسجد (لاہور) میں حدیث کی بعض کتابیں پڑھیں اور سند لی۔ مولانا سید محمد داؤد غزنوی ان پر بہت اعتماد فرماتے تھے۔ ایک مرتبہ اپنی بیماری کے زمانے میں مولانا غزنوی نے ان کو خط لکھا تھا کہ چینیاں والی مسجد میں جمعہ پڑھایا کریں، لیکن یہ اپنی بعض مجبوریوں کی وجہ سے یہ خدمت انجام نہیں دے سکے تھے۔ گکھڑ کی اولیں مسجد اہل حدیث مسجد توحید گنج ہے۔ یہ مسجد حافظ صاحب کے والدِ گرامی نے اپنے ذاتی مکان میں اپنے خرچ سے تعمیر کرائی تھی۔ اب یہ وہاں کی مشہور مسجد ہے۔ اس میں حفظ قرآن کا مدرسہ بھی جاری رہا۔ حافظ صاحب نے 7۔ مئی 1980ء کو گوجراں والا میں وفات پائی۔

ذیل میں دو خواب درج کیے جا رہے ہیں جو مولانا احمد الدین گکھڑوی نے دیکھے اور حافظ صاحب سے بیان کیے۔ مولانا کی وفات کے گیارہ بارہ روز بعد 16۔ جون 1973ء کو حافظ صاحب نے بذریعہ خط یہ دونوں خواب حضرت مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی کو

بتائے اور پھر یہ خواب 13۔ جولائی 1973ء کے اخبار ''الاعتصام'' میں شائع ہوئے۔ اب یہ خواب اس کتاب میں درج کیے جا رہے ہیں۔ ملاحظہ فرمایے۔

16۔ جون 1973ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محترمی ومکرمی حضرت مولانا محمد عطاء اللہ صاحب حنیف زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مولانا احمد الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جنازے کا وقت جو آپ نے ارشاد فرمایا تھا، مولانا کے لواحقین نے منظور کیا اور الحمد للہ اس کے نتائج بھی خاطر خواہ رہے اور اس ولی اللہ کے جنازے میں ہزاروں افراد نے شرکت کی۔ اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ وادخلہ فی عبادک الصالحین۔

مرحوم کے دو خواب میرے خیال میں شاید اور کسی کو معلوم نہ ہوں۔ مَیں وہ عرض کر دیتا ہوں۔ مزید احوال کے لیے آپ مولانا محمد اقبال صاحب نظام آبادی خطیب جامع مسجد اہل حدیث قلعہ گجر سنگھ (لاہور) سے معلوم کرلیں۔ موصوف مولانا مرحوم کے شاگرد ہیں۔ مولوی ہدایت اللہ صاحب ڈھونی کے والے، مولوی عبدالسلام عرف روشن دین پونچھوی اور حافظ عبدالقادر صاحب روپڑی کے علاوہ بھی ان کے بہت سے شاگرد ہیں۔ ان سے بھی رابطہ قائم کرنے پر حالات معلوم ہو سکتے ہیں۔

پہلا خواب:

محترم مولانا احمد الدین اُن دنوں مرزائیوں سے مناظرات میں مشغول تھے اور مقامی دو عدد مرزائی علم دین اور اللہ دوھایا سے حدّادی کی دکان پر جہاں ہم جا کر تعلیم حاصل کرتے تھے، دن بھر گفتگو رہتی تھی تا کہ ان مقامی مرزائیوں کو راہِ راست پر لایا جائے، لیکن وہ دونوں اپنے فاسد عقیدے پر مرے۔

انہی ایام میں مولانا صاحب مرحوم نے ایک رات خواب دیکھا:

''لوگوں کا بہت بڑا ہجوم ان کے مکان پر جمع ہے اور انھوں نے شور مچایا ہوا ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کا جنازہ ان کے مکان پر موجود ہے۔ مولانا یہ بات سن کر گھر گئے تو دیکھا کہ واقعی چار پائی پر ایک نعش رکھی ہوئی ہے اور اس سے بد بو اٹھ رہی ہے۔ مولانا نے فوراً حکم فرمایا کہ اس خبیث کو اٹھا کر فوراً لے جاؤ۔ چنانچہ اس کو اٹھا کر لے جایا گیا۔''

میرے خیال میں ان کی تبلیغ سے واقعی مرزائیت کا جنازہ اٹھ گیا، چنانچہ غالباً اس خواب کے بعد مولانا نے شملہ میں جلال الدین شمس مرزائی سے مناظرہ کیا اور اسی میدان میں 17 مرزائی مرزائیت سے تائب ہو گئے۔

دوسرا خواب:

بوہڑ والی مسجد اور دیگر مساجد جو گکھڑ میں اس وقت موجود تھیں یعنی قیام پاکستان سے پہلے۔ یہ سب مسجد یں ان بریلویوں کے قبضے میں تھیں جو آج کل کے بریلویوں سے بہت بہتر تھے۔ مولانا احمد الدین صاحب اور ان کے چچیرے بھائی مولوی فضل احمد صاحب اور پھر کچھ وقفے کے بعد میرے محترم بھائی ابوالشفا حکیم محمد امین صاحب کی کوششوں سے لوگ توحید وسنت سے روشناس ہوئے۔ چنانچہ مولانا احمد الدین صاحب مرحوم نے غالباً ایک سال تک گکھڑ کی مسجد بوہڑ والی میں جمعۃ المبارک کا خطبہ دیا، جس سے لوگوں کے دل بہت حد تک توحید وسنت کی طرف مائل ہو گئے۔ سب نے مل کر مولانا مرحوم سے کہا کہ اگر آپ رفع الیدین اور آمین بالجہر ترک کر دیں تو آپ ہی جمعہ پڑھایا کریں، آپ کو ماہوار وظیفہ بھی پیش کیا جائے گا۔ مولانا سخت غصے میں آ کر فرمانے لگے کہ اگر مجھے جارج پنجم (جو اس وقت حکومت برطانیہ کا بادشاہ تھا) تخت بھی دے اور سنت چھوڑنے کے لیے کہے تو میں ہرگز قبول نہ کروں گا۔ اس کے بعد مولانا نے وہاں کی خطابت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ پھر مولوی علم الدین صاحب دیوبندی آئے۔ ان موصوف کی امامت وخطابت کے دوران ہی میرے

والد محترم کو بوہڑ والی مسجد سے محض رفع الیدین اور آمین بالجہر کی بنا پر زدوکوب کر کے نکالا گیا۔ اس واقعہ کے بعد ہی میرے والد محترم نے اپنا ایک ذاتی مکان مسجد اہل حدیث کے لیے وقف کیا تھا، جو آج کل مسجد توحید گنج کی شکل میں موجود ہے۔

میں لاہور میں تعلیم اور ملازمت کے شغل میں مشغول تھا کہ گکھڑ کی اس بوہڑ والی مسجد میں انقلاب آ گیا۔ یعنی مولوی علم الدین صاحب کو برطرف کر کے مولوی محمود صاحب دیوبندی کو جو غالباً مولانا حسین علی واں بھچراں والا کے شاگرد یا مرید تھے، لایا گیا۔ ان سے مولانا احمد دین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی گفتگو فاتحہ خلف الامام پر کئی دن تک رہی۔ اس گفتگو میں مَیں بھی موجود تھا۔ مولانا محمود صاحب اس گفتگو میں اپنے آپ کو دلائل کے لحاظ سے ہلکا محسوس کرتے تھے اور اس کمی کو پورا کرنے کے لیے موصوف اپنے مقتدیوں کو گلی میں لے جا کر اکیلے کھڑے ہو کر سمجھانے کی کوشش کرنے لگے۔

اسی دوران میں ایک دن مولانا احمد الدین نے فرمایا کہ آج میں نے ایک خواب دیکھا ہے کہ "میں گھر پر موجود نہیں ہوں۔ مجھے کسی نے آ کر اطلاع دی کہ آپ کے گھر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ مہمان آئے ہوئے ہیں۔ میں گھر پہنچا تو حضرت امام رحمۃ اللہ علیہ کو سفید لباس میں نہایت خوب صورتی کے عالم میں دیکھا۔ میں ان کے پاس بیٹھ گیا اور گفتگو شروع ہوئی۔ میں نے گفتگو کے دوران امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ اگر آپ کو صحیح حدیث فاتحہ خلف الامام کے بارے میں مل جاتی تو آپ اس کے متعلق وہ کچھ نہ کہتے جو آج کل کہا جا رہا ہے۔ اس جملے پر حضرت امام مسکرا دیئے۔

بندہ عرض کرتا ہے کہ واقعی امام صاحب کو ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ حضرت امام نے فرما دیا ہے۔ **اذا صح الحدیث فھو مذھبی۔**"

(جب صحیح حدیث مل جائے تو وہی میرا مذہب ہے)

خواب ختم ہوا۔

اس سے آگے حافظ صاحب مولانا عطاء اللہ صاحب کو لکھتے ہیں:

آپ ''الاعتصام'' کے ذریعے لوگوں سے اپیل کریں کہ وہ مولانا احمدالدین کے حالات اور علمی نکات نقل کر کے بھیجیں جیسا کہ ان کا ایک علمی لطیفہ مجھے بھی یاد آ گیا ہے۔

ایک چکڑالوی منکر حدیث سے مولانا احمدالدین کی گفتگو ہوئی۔ مولانا نے فرمایا: یہ بتاؤ کہ فرعون کیوں غرق ہوا؟ اس نے کیا جرم کیا تھا؟ کیا اس نے تورات کا انکار کیا تھا؟

جب مولانا نے بار بار اسے جھنجھوڑا تو اس نے کہا کہ آپ ہی بتائیں۔

مولانا نے فرمایا:

''تورات فرعون کے غرق ہو جانے کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو دی گئی۔ ولقد اتینا موسی الکتاب اَلایۃ (سورہ قصص) اس کے غرق ہونے کا سبب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی حدیث سے انکار تھا۔ حدیث موسوی کو نہ مانا تو ڈبو دیا گیا۔''

والسلام (دعا گو محمد یوسف گکھڑوی)

خوانندگانِ محترم نے حافظ محمد یوسف صاحب گکھڑوی مرحوم و مغفور کے رقم فرمودہ الفاظ پڑھے۔ انھوں نے چند حضرات کے اسمائے گرامی تحریر فرمائے ہیں کہ ان سے رابطہ قائم کیا جائے تو مولانا احمدالدین کے حالات، مناظرات کے واقعات اور ان کے بیان کردہ علمی نکات کا پتا چل سکتا ہے۔ خود بھی انھوں نے ایک منکرِ حدیث سے گفتگو کرتے ہوئے مولانا مرحوم کا ''حدیث موسیٰ'' والا نکتہ بیان کیا جو نہایت عمدہ علمی نکتہ ہے۔ لیکن ان کی وفات کے بعد ان سے متعلق کسی عالم دین، ان کے کسی شاگرد اور ان کے کسی رفیقِ مناظرہ و وعظ نے کچھ نہیں لکھا۔ مولانا کی وفات جون 1973ء کو ہوئی اور حافظ صاحب نے ان سے سات سال بعد مئی 1980ء میں سفر آخرت اختیار فرمایا۔ لیکن سات سال کے اس طویل عرصے میں خود انھوں نے بھی کچھ نہیں تحریر فرمایا، صرف یہی کچھ لکھا جو اوپر درج کر دیا گیا ہے۔

مولانا احمدالدین گکھڑوی علمی اعتبار سے بڑے نکتہ شناس اور استدلالی مزاج کے عالم

دین تھے اور استنباط مسائل کی بے پناہ صلاحیت ان میں پائی جاتی تھی۔ کہنا چاہیے کہ وہ اس سلسلے میں کسی حد تک ''درجۂ اجتہاد'' پر فائز تھے۔ افسوس ہے ان کی اس قسم کی صلاحیتوں کو کما حقہ اجاگر نہیں کیا گیا اور ہم ان کے بیان فرمودہ بے شمار علمی نکات سے محروم رہ گئے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ''محرومی'' کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔؟

اس سوال کا جواب بڑا تلخ ہے۔ میں معذرت کے ساتھ عرض کروں گا کہ اس کی ذمہ داری ان سب حضرات پر عائد ہوتی ہے جو ان سے دوستی اور تلمذ کا تعلق رکھتے تھے اور ان کے ساتھ جلسوں اور مناظروں میں شرکت فرماتے تھے۔ ان کی رفاقت میں سفر کرتے اور ان سے تقریریں کراتے تھے۔ ان کا فرض تھا کہ ان کی مجلسی گفتگو کا ریکارڈ بھی رکھتے اور ان کے مناظروں کی تفصیل بھی ضبطِ تحریر میں لاتے۔

انھیں خوب معلوم تھا کہ وہ خود بے اولاد ہیں اور ان کے بھتیجے بھانجے اور دیگر رشتے دار بے علم ہیں۔ اس صورت میں تحریر وکتابت کے اصل ذمہ دار ان کے دوست احباب اور شاگرد ہی تھے۔ لیکن انھوں نے اس ذمہ داری کا احساس نہ فرمایا۔

اس قسم کی باتوں کے پیش نظر میرا پھر جی چاہتا ہے کہ اپنے اہل علم عزیزوں اور دوستوں کی خدمت میں انتہائی ادب کے ساتھ عرض کروں کہ اپنی علمی تاریخ کو منجمد نہ کریں، جہاں تک ممکن ہو اپنی علمی مساعی کو قلم وقرطاس کی گرفت میں لانے کی کوشش فرمائیں۔

مولانا احمد الدین گکھڑوی کے جو واقعات قارئین کرام کے مطالعہ میں آئے ہیں۔ ان کے حصول کے لیے اس فقیر کو بڑی تگ وتاز کرنا پڑی ہے۔ دن رات لگا کر بے حد محنت سے یہ کتاب مکمل ہوئی ہے۔

بارگاہِ الٰہی میں عاجزانہ دعا ہے کہ وہ اس مخلص تریں خادم دین کو جو احمد الدین کے نام سے موسوم تھا، جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔

اللهم اغفر له وارحمه وادخله جنت الفردوس.

پچیسواں باب

مولانا احمد دین گکھڑوی کی وفات پر تعزیتی قراردادیں

آج سے 37 سال قبل کی یہ چند تعزیتی قراردادیں بھی پڑھ لیجیے۔ یہ قراردادیں لکھنے اوران کی وفات پر تقریریں کرنے اوران کا غائبانہ جنازہ پڑھنے والے حضرات میں سے معلوم نہیں اب کوئی صاحب زندہ ہیں یا نہیں۔ بہرحال یہ بھی تاریخ کا چھوٹا سا ایک ورق ہے جو پیش خدمت ہے۔

مسجد توحید گنج کی قرارداد

آہ! علم کا چراغ بجھ گیا

جماعت اہل حدیث کی روح رواں شخصیت، قابلِ قدر خطیب اور مایہ ناز مبلغ ومناظر مولانا احمد الدین گکھڑوی کی وفات پر جامع اہل حدیث مسجد توحید گنج گکھڑ میں زیر صدارت مولانا عبدالواحد ایک ہنگامی تعزیتی اجلاس ہوا، جس میں مولانا مرحوم کی خدمات کو سراہا گیا اوران کے لیے دعائے مغفرت کی گئی۔ مولانا مرحوم دین حنیف کے خادم اور مسلک اہل حدیث کے شیدائی اوراس کے بے باک مبلغ تھے۔ انھوں نے ساری زندگی اسلام کی حقانیت کو واضح اور ثابت کرنے میں گزاردی۔ ان کی تقریری (جس میں مناظرات خصوصاً شامل ہیں) وتحریری خدمات مسلّم ہیں۔ مولانا میدانِ مناظرہ کے شہسوار تھے۔ ہر مناظرے میں اللہ تعالیٰ نے ان کو کامیابی دی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو دولتِ علم سے مالا مال کیا تھا۔

یہ اجلاس ان کی وفات کو ناقابلِ تلافی المیہ تصور کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے اورانھیں اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

(ناظم مسجد توحید گنج اہل حدیث گکھڑ)

وفاتِ حسرت آیات

مناظرِ اسلام حضرت مولانا احمد دین صاحب گکھڑوی کی دائمی جدائی ہمارے لیے انتہائی رنج والم کا باعث ہے، جمعے کے دن مدرسہ دارالحدیث کے مدرس حضرت مولانا محمد علی صاحب کوٹ کبیری نے ان کی سیرت پر خطبہ دیا اوران کی زندگی کے نمایاں پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔مولانا نے کہا کہ مولانا احمد الدین کی وفات سے علمائے اہل حدیث کی صف میں جو خلا پیدا ہوا ہے، اس کا پُر ہونا ناممکن ہے اور کہا کہ مولانا مرحوم مناظر اعظم بھی تھے اور کامیاب مبلغ ومقرر بھی۔ان کے دلائل ایک ایٹم کی حیثیت رکھتے تھے۔مولانا محمد علی نے ان کے کچھ مناظرے بھی عوام کو سنائے ،انھوں نے کہا کہ مرحوم کی زندگی کا مشن اسلام کی خدمت اور مذہبِ حقہ پر طاغوتی حملوں کا جواب دینا تھا۔اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر دے اور کروٹ کروٹ ان پر رحمت کے پھول برسائے۔انھیں اعلیٰ علیین میں جگہ عنایت فرمائے۔نماز جمعہ کے بعد مولانا مرحوم کی نماز جنازہ غائبانہ ادا کی گئی۔

محمد صدیق (ناظم شعبہ نشرواشاعت کوٹ کبیر)

موت العالِم موت العالم

مورخہ 21۔جون بروز جمعرات بعد از نماز عشاء جمعیت طلبا مدرسہ دارالحدیث محمودیہ کوٹ کبیر کا ایک ہنگامی اجلاس منعقد ہوا، جس میں مناظر اسلام، عالم بے بدل حضرت مولانا احمد دین صاحب گکھڑوی کی وفات پر گہرے رنج والم کا اظہار کیا گیا اوران کی وفات کو جماعت کے لیے ناقابل تلافی نقصان قرار دیا گیا۔مولانا مرحوم نے اپنی پوری زندگی اسلام کی خدمت میں صرف کردی۔اللہ تعالیٰ کی ان خدمات قبول فرمائے اور انھیں اپنی رحمت ومغفرت سے نوازے۔

(محمد یٰسین کوٹ کبیری ناظم جمعیت طلبائے مدرسہ دارالحدیث محمودیہ کوٹ کبیر)

ایک نا قابلِ تلافی نقصان

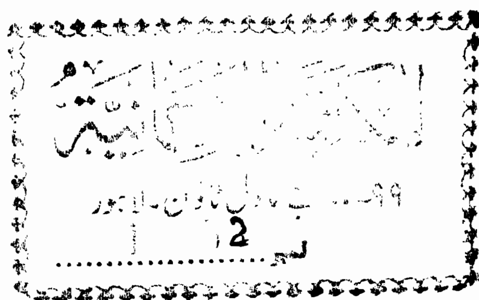
مناظرِ اسلام مولانا احمد دین گکھڑوی کی وفات کو آزاد کشمیر کے جماعتی حلقوں میں شدت سے محسوس کیا گیا اور ان کی وفات کو جماعت کے لیے ایک نا قابلِ تلافی نقصان قرار دیا گیا۔ راقم نے ایک خطبے میں ان کی جماعتی و مسلکی خدمات اور ان کی علمی و مناظرانہ سرگرمیوں کو خراج تحسین پیش کیا اور جمعے کے بعد نمازِ جنازہ غائبانہ ادا کی گئی۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور جماعت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

(سید عبدالحی شاہ خطیب مرکزی اہل حدیث)

یہ مولانا مرحوم کی وفات پر تعزیت کی چند قراردادیں اور خبریں ہیں جو اخبار ''الاعتصام'' میں شائع ہوئیں اور ہمارے علم میں آئیں۔ معلوم نہیں کہاں کہاں ان کی وفات پر اظہار حزن و ملال کیا گیا ہوگا اور کس کس بزرگ نے تعزیتی تقریریں کی ہوں گی۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

☆☆☆



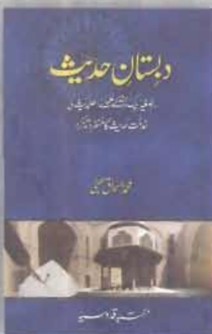
صاحب طرز ادیب جناب **محمد اسحاق بھٹی** کے قلم سے



برّصغیر میں
اہلِ حدیث کی آمد



برصغیر کے
اہلِ حدیث خُدّام قرآن



دبستانِ حدیث